خصوصی تعلیماتِ اسلامیہ امامیہ کا بے باک ترجمان

جلد ۱۹ مارچ ۲۰۱۵ء شمارہ ۳

فہرست مضامین

مُدیرِ اعلیٰ: ملک مُمتاز حسین اعوان
مُدیر: گلزار حسین محمدی
پبلشر: ملک مُمتاز حسین اعوان
مطبع: انصار پریس بلاک ۱۰
مقام اشاعت: جامعہ علمیہ سلطان المدارس سرگودھا
کمپوزنگ: الخطّاط کمپیوٹرز 0307-6719282
فون: 048-3021536

زرِ تعاون 400 روپے
لائف ممبر 5000 روپے

اداریہ

شکار پور دہشت گردی کا شکار

پاک سرزمین کئی سالوں سے دہشت گردی، قتل اور غارت گری کا شکار ہے۔ دہشت گردوں نے ملک کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ سیکورٹی فورسز، مساجد، امام بارگاہیں حتیٰ کہ سکولز اور مدارس بھی دہشت گردی کی زد میں آچکے ہیں۔ پورا ملک بدامنی اور پریشانی میں مبتلا ہے۔ پشاور آرمی پبلک سکول اور امام بارگاہ عون محمد رضوی راولپنڈی کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ چند روز قبل شکار پور سندھ امام بارگاہ کربلا میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد مومنین دعا میں مشغول تھے کہ خود کش بمبار اندر داخل ہوا اور دھما کا سے بچے جوان بوڑھے نمازی شدید زخمی ہو گئے۔ اکسٹھ قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں اور اتنے ہی مومنین زخمی ہسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔ حکمرانوں کے بلند بانگ دعوے کہاں گئے کہ دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ دیں گے۔ حکمرانوں اور سیکورٹی فورسز کے لیے شکار پور کا سانحہ سوالیہ نشان ہے، جو حکومت عوام کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتی اسے حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر واقعہ رونما ہونے کے بعد صوبائی اور مرکزی حکومتیں روایتی بیانات دے کے تھپکی دے دیتی ہیں۔ مگر حکومتی ادارے دہشت گردوں کے عزائم کو خاک ملانے کی کوشش نہیں کر پاتے۔ کراچی شہر میں شیعہ علماء اور ڈاکٹرز کی ٹارگٹ کلنگ جاری ہے۔ سندھ حکومت کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو چاہیے کہ دہشت گردوں اور ان کے حامیوں اور مددگاروں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹیں۔ ایک فوجی آمر کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ملک دہشت گردی کی دلدل میں پھنس کے رہ گیا ہے۔ افواجِ پاکستان دہشت گردی کے خاتمے کے لیے آپریشن ضرب عضب علاقہ وزیرستان میں کر رہی ہے، اسی طرز کے آپریشن پورے ملک اور تمام شہروں میں کیے جائیں اور تمام وہ اقدامات کیے جائیں جس سے دہشت گردوں کا نیٹ ورک ختم ہو جائے۔

اس وقت پوری قوم کا افواج پاکستان پر مکمل اعتماد ہے اور ان کے شانہ بشانہ ہونے پر متفق ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ یہ دہشت گرد اسلام کے نام پر ظلم و ستم کو روا رکھے ہوئے ہیں، حالانکہ اسلام تو حیوانات پر بھی رحم و کرم کا درس دیتا ہے، چہ جائیکہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے۔ خود کش حملوں اور دہشت گردی کے خلاف تمام مکاتب فکر کے علماء فتاویٰ جاری کر چکے ہیں، لہٰذا دہشت گردوں کے قلع قمع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ حکمران، حزب اختلاف، علمائے کرام اور میڈیا والے سب مل کر دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے ہنگامی بنیادوں پر جدوجہد کریں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرزمین پاک کو دہشت گردی کے ناپاک وجود سے پاک فرمائے اور امن و سلامتی سے مل جل کر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب العقائد

شرک کی مذمت اور اس کی حقیقت

تحریر: آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین نجفی مدظلہ العالی موسس و پرنسپل جامعہ سلطان المدارس سرگودھا

جاہلی دور کے بقیۃ السیف ان غلط عقائد و نظریات میں سے جو اسلام کی کفر کش اور شرک شکن تلوار سے بچ گئے اور بدقسمتی سے عالم اسلام کی اکثریت ان کی زد میں آگئی۔ ایک مسئلہ شرک بھی ہے۔ اسلام میں شرک کو اکبر الکبائر اور ناقابل معافی جرم و گناہ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ج وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا (سورۃ النساء: ۴۸)

"خداوند عالم (بلا توبہ) شرک کو ہرگز معاف نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ جو گناہ ہیں جو جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے"۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے شرک سے پاک عقیدہ توحید ہی اسلام کا طرۂ امتیاز ہے، ورنہ خداوند عالم کی ذات پر اجمالی اعتقاد و ایمان تو اسلام سے پہلے بھی تمام مذاہب و ادیان میں موجود تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (سورۃ لقمان: ۲۵)

"اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، فرمایا:

من مات ولم یشرک باللہ شیئا دخل الجنۃ

"جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دیا ہو وہ بلاشبہ جنت میں داخل ہوگا"۔ (توحید شیخ صدوقؒ)

دوسری حدیث میں یوں فرمایا:

من مات یشرک باللہ دخل النار

"جو شخص اس حال میں مرے کہ شرک کرتا ہو وہ جہنم میں داخل ہوگا"۔ (بحار الانوار جلد ۲)

قرآن مجید میں بھی ہے:

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ط وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (سورۃ المائدۃ: ۷۲)

"جو شخص شرک کرے خدا نے اس پر جنت حرام قرار دیدی ہے"۔

اس کے باوجود امت مرحومہ کی اکثریت کسی نہ کسی رنگ میں شرک جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ خود خدائے علیم و خبیر خبر دیتا ہے کہ:

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (سورۃ یوسف: ۱۰۶)

"اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے مگر اس حالت میں کہ وہ مشرک بھی ہوتے ہیں"۔

خلاصہ یہ کہ غیر اللہ کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو صرف خداوند عالم کے ساتھ روا رکھنا چاہیے، وہ شرک ہے۔

شرک جلی و خفی

اس شرک کی کئی قسمیں ہیں:

① شرک جلی ② شرک خفی

پھر ان دونوں قسموں کی آگے کئی کئی قسمیں ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر بڑے اختصار کے ساتھ ذیل میں ان اقسام کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ (تفصیل کے خواہشمند حضرات ہماری کتاب "احسن الفوائد" کی طرف رجوع فرمائیں)

شرک جلی کے چہارگانہ اقسام کا بیان

شرک جلی کی چار قسمیں ہیں۔

① شرک ذاتی: یعنی ازلی وابدی، حی لایموت خدائے واجب الوجود کی ذات والاصفات میں کسی اور کو شریک قرار دینا۔ حالانکہ وہ واحد ویکتا ہے۔ قل ھو اللہ احد

② شرک صفاتی: یعنی خدا کی صفات حقیقیہ میں کسی کو شریک قرار دینا۔ چونکہ خداوند عالم کی صفاتِ حقیقیہ ذاتیہ عین ذات ہیں یعنی ذات وصفات میں کبھی جدائی کا تصور بھی نہیں ہوسکتا...... اس مرحلہ میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ باقی جس قدر مخلوق ہے اس کی صفاتِ کمالیہ زائدہ برذات ہیں۔ جس طرح اس کی ذات تخلیق خالق کا نتیجہ ہے اسی طرح اس کی صفات بھی عطیۂ الٰہی کا ثمرہ ہے۔

③ شرک افعالی: یعنی اللہ کے ان کاموں میں کسی کو شریک قرار دینا جن کاموں پر کوئی بھی مخلوق من حیث المخلوق قادر نہیں ہے۔ جیسے خلق کرنا، رزق دینا، مارنا، جلانا، اور بیمار کو شفاء دینا (وغیرہ افعال تکوینیہ)

ارشادِ قدرت ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (سورۃ الروم:۴۰)

"اللہ وہی تو ہے جس نے پہلے تمھیں پیدا کیا، پھر رزق دیا، پھر تمھیں موت کا ذائقہ چکھائے گا اور پھر تمھیں زندہ فرمائے گا، جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، ان میں کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے۔ خدا مشرکوں کے شرک سے پاک پاکیزہ ہے"۔

لہٰذا اللہ کے سوا کسی کو خالق ورازق، محیی وممیت اور شافی الامراض وقاضی الحاجات جاننا شرک افعالی ہے۔

شرک عبادتی: یعنی مقام عبادت میں کسی کو خدا کا شریک قرار دینا۔ خدا کی طرح اس کی عبادت کرنا اور اسی کی طرح شدائد ومصائب میں اسے پکارنا۔ ارشادِ قدرت ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (سورۃ النساء:۳۶)

"خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا (سورۃ الکہف:۱۱۰)

"جو شخص اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نیک عمل بجالائے اور اپنے

باقی صفحہ ۹ پر

تحریر: آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین نجفی مدظلہ العالی موسس و پرنسپل جامعہ سلطان المدارس سرگودھا

یہ درست ہے کہ خواص (سمجھ دار، دیندار لوگ) ایسا نہیں کرتے مگر بعض عوام کو دیکھا گیا ہے کہ وہ علم مبارک بلکہ تعزیہ و ذوالجناح کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ اسے سجدۂ تعظیمی کا نام دیتے ہیں۔

سو واضح ہو کہ شریعت مقدسہ اسلامیہ میں ہر قسم کا سجدہ تعبیدی ہو یا تعظیمی خالق کائنات کے ساتھ مختص ہے۔ اور کسی بھی مخلوق کے لیے حتی کہ نبی و امام کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔

اس موضوع پر ہم نے بڑی تفصیل کے ساتھ "احسن الفوائد فی شرح العقائد" میں بحث کی ہے یہاں اس کا ایک شمہ درج کیا جاتا ہے۔

ارشادِ قدرت ہے:

فاسجدوا للہ واعبدوا

"خدا کے لیے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو"۔

نیز ارشادِ قدرت ہے:

وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا

(سورۃ الجن:)

"یقیناً سجدہ گاہیں اللہ کے لیے ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو"۔

المساجد سے مراد اعضاء سجدہ ہیں۔ یعنی پیشانی، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور پاؤں کے دونوں انگوٹھے۔ (کافی، تفسیر صافی، تفسیر قمی)

حضرت امام رضا علیہ السلام نے "فلا تدعوا مع اللہ احدا" کے معنی بیان فرمائے ہیں: "فلا تشرکوا مع غیرہ فی سجودکم علیہا" یعنی: فلا تدعوا...... کا مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سجدہ پر خدا کے علاوہ کسی اور کا سجدہ کر کے شرک نہ کرو۔ (اربعین شیخ بہائی شرح حدیث)

یہ آیت مبارکہ اس بات پر نص صریح ہے کہ ہر قسم کا سجدہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

پورا دفتر حدیث موجود ہے کوئی ایک روایت بھی غیر اللہ کے سجدہ کرنے کے جواز پر موجود نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا ایسا واقعہ موجود ہے کہ کسی نبی یا امامؑ نے کسی شخص سے اپنا سجدہ کرایا ہو۔ یا کسی نے کرنا چاہا ہو اور انھوں نے اجازت دی ہو۔ اس کے برعکس چہاردہ معصومین علیہم اللام کے حالات زندگی میں بیسیوں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ کئی مرتبہ کم عقل و کم علم ارادت مندوں نے ان ذوات مقدسہ کو سجدہ کرنا چاہا (ظاہر ہے کہ وہ سجدۂ تعظیمی ہی تھا) مگر انھوں نے ان کو ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اور ساتھ ہی یہ وضاحت کر دی کہ:

فلا تسجد لی و اسجد للحی الذی لا یموت

''مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ اس حی و قیوم کو سجدہ کر جس کے لیے موت نہیں ہے''۔

(ارشاد رسول مقبولؐ بحوالہ دیلمی و کنز العمال وغیرہ)

''اسجد للہ و لا تسجد لی''

''اللہ کو سجدہ کر اور مجھے سجدہ نہ کر''۔

(ارشاد جناب امیرؑ عماد الاسلام جلد ۱ صفحہ ۳۳۵)

جناب رسولِ خداؐ کا یہ فرمان بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے کہ: ''اگر غیر خدا کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔

(اصول کافی)

ایک مشہور شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں اہل زیغ و ضلال ہمیشہ ملائکہ اور والدین یوسفؑ کے سجدوں سے استدلال کیا کرتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی عظیم الشان مخلوق کو سجدہ تعظیمی کرنا جائز ہے، اس کے متعلق دو گزارشات عرض کرنا ہیں۔

پہلی یہ کہ ائمہ طاہرینؑ کی متعدد روایات سے واضح ہوتا ہے کہ جناب آدمؑ کو قبلہ بنایا گیا تھا اور سجدہ خدا کو کرایا گیا تھا۔ چنانچہ علامہ مجلسیؒ حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۴۴ پر ایک طویل حدیث کے ضمن میں امام حسن عسکری علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں:

''نبود سجدہ ایشان از برائے آدم بلکہ قبلہ ایشان بود از جائے خدا سجدہ می کردند و امر نمود حق تعالیٰ کہ بجانب او رو آوردند''۔

یعنی ملائکہ کا سجدہ آدم کے لیے نہ تھا بلکہ سجدہ خدا کو تھا اور حکم خدا سے آدم کو قبلہ بنایا گیا تھا۔

اور والدین برادرانِ یوسفؑ کا سجدہ، سجدۂ شکر تھا جو انھوں نے جناب یوسف کو زندہ اور مسند اقتدار پر قابض دیکھ کر خدا کی بارگاہ میں ادا کیا تھا۔

(ملاحظہ ہو العروۃ الوثقیٰ)

دوسری یہ کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا، تو جن شریعتوں میں یہ جائز تھا وہ اب منسوخ ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اب ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علامہ مجلسیؒ حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۲۶ طبع نولکشور لکھنؤ پر مباحثِ طویلہ کے بعد لکھتے ہیں:

''محتمل است کہ سجدۂ تحیت در امم سابقہ مجوز بودہ باشد در یں امت حرام شدہ باشد و احادیث بسیار بر نہی از سجدہ از برائے غیر خدا وارد شدہ''۔

یعنی: ''ممکن ہے کہ بعض سابقہ امتوں میں یہ سجدۂ تعظیمی جائز ہو مگر اس امت (اسلامیہ) میں اسے بہر حال حرام قرار دید یا گیا ہے اور بہت سے احادیث میں وارد ہے کہ غیر خدا کے لیے سجدہ جائز نہیں ہے''۔

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح ہے کہ:

''فاحفظہ فانہ بالحفظ جدیر و لا ینبئک مثل خبیر''

ویسے عقلا بھی اگر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہے کہ جب کوئی عام عبادت غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے تو جو افضل عبادت نماز کا افضل رکن ہو (سجدہ) وہ غیر خدا کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

لہٰذا علم مبارک، تعزیہ مبارک، ذوالجناح مبارک

اور مشاہد مقدسہ و مزاراتِ منورہ کو سجدۂ تعظیمی کرنے سے اجتناب واجب و لازم ہے۔ ہاں اگر مشرف بزیارت ہونے کے بعد اس سعادتِ عظمیٰ کے حصول پر خالق کا سجدۂ شکر ادا کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے۔

تعزیہ مبارک

شرعی نقطہ نظر سے اس کی اباحت و جواز یعنی اس کا مباح اور جائز ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کیونکہ یہ بے جان، روضہ مبارک سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی بے جان شبیہ ہے جو بالاتفاق جائز ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تصویریں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ یا تو ذی روح مخلوق کی ہوں گی یا غیر ذی روح کی۔ پھر ان دونوں قسموں کی آگے دو دو قسمیں ہیں یا تو وہ تصویر مجسّم ہوگی (جسم دار) یا غیر مجسّم (جیسے کاغذ پر نقش و نگار)

لہٰذا اگر یہ تصویر غیر ذی روح کی ہے تو یہ علی الاطلاق بالاتفاق جائز ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ: "یعملون له ما یشاء من محاریب و تماثیل وجفان کالجواب و قدور راسیات" کی تفسیر میں وارد ہے کہ (وہ تصویریں جو جناب حضرت سلیمانؑ کے لیے بناتے تھے) مردوں یا عورتوں کی نہ تھیں بلکہ یہ درختوں و مکانوں، الغرض غیر ذی روح چیزوں کی تھیں۔

(کافی وصافی وغیرہ)

اور اگر وہ تصویر ذی روح مخلوق کی ہے اور ہے بھی مجسّم تو یہ بالاتفاق حرام ہے اور اگر غیر مجسّم ہے تو اس میں فی الجملہ اختلاف ہے۔ اظہر نہیں تو احوط یہ ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مناہی میں مذکور ہے۔

نهی ان ینقش شئ من الحیوان علی الخاتم

کہ آپ نے انگوٹھی پر حیوان کی تصویر بنانے کی ممانعت فرمائی۔

(من لایحضرہ الفقیہ از قوانین الشریعہ فی فقہ الجعفریہ جلد ۲ صفحہ ۱۸)

لہٰذا اگر کوئی شخص تعزیہ کے جواز پر زبانِ اعتراض دراز کرتا ہے تو وہ اپنے مذہبی و فقہی قواعد و ضوابط سے اپنی جہالت و لاعلمی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مگر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کے بنانے کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بنانے کی اصلی غرض و غایت صرف یہ ہے کہ مظلومِ نینوا کی مزارِ مقدس کی شبیہ پیشِ نظر رہے اور واقعاتِ کربلا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس طرح حزن و ملال اور گریہ و بکا میں اضافہ و ازدیاد ہو۔ جو علاوہ باعث اجر و ثواب بے حساب ہونے کے ایک مقصد اقصیٰ یعنی مظلوم سے الفت اور ظالم سے نفرت تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اس طرح دراصل نظامِ مصطفیٰ اور انتظامِ مرتضیٰ کے احیاء کا سامان فراہم کرنا مقصود و مطلوب ہے۔

فرمانِ امیر المومنین علیہ السلام

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: مَا مِنْ مُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ يَضَعُ يَدَهُ عَلَىٰ رَأْسِ يَتِيمٍ إِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِكُلِّ شَعْرٍ مَرَّتْ يَدَهُ عَلَيْهَا حَسَنَةً۔

کوئی بھی مومن مرد یا عورت جب اپنا ہاتھ یتیم کے سر پر رکھتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے لیے ہر بال کے بدلے ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔ (میزان الحکمۃ ۲۲۵۸۰)

باب التفسیر

کتاباً موقوتاً کا مفہوم اور جمع بین الصلوٰتین پر تبصرہ

تحریر: آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین نجفی مدظلہ العالی مؤسس و پرنسپل جامعہ سلطان المدارس سرگودھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾ وَ لَا تَہِنُوۡا فِی ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ ؕ اِنۡ تَکُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّہُمۡ یَاۡلَمُوۡنَ کَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَ تَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا یَرۡجُوۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۰۴﴾

(سورۃ النساء: ۱۰۲ و ۱۰۳)

ترجمۃ الآیات

بے شک نماز اہل ایمان پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ (۱۰۳) اس (مخالف) جماعت کی تلاش اور تعاقب میں سستی نہ دکھاؤ، اگر اس میں تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو انھیں بھی پہنچتی ہے۔ اسی طرح تکلیف پہنچتی ہے جس طرح تمھیں پہنچتی ہے اور تم اللہ سے اس چیز (ثواب) کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔ (۱۰۴)

تفسیر الآیات

ان الصلوۃ کانت ......الایۃ

کتاباً موقوتاً کا مفہوم

کتاباً موقوتاً کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ''مفروض لوقتہ'' اپنے مقررہ وقت پر فرض ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر نماز کے تین تین وقت ہیں: ① وقت مختص ② وقت مشترک ③ اور وقت فضیلت اور یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ ہر نماز کا اپنے وقت فضیلت پر الگ الگ ادا کرنا افضل ہے۔

جمع بین الصلوٰتین پر تبصرہ

یہ جو قدیم الایام سے جمع بین الصلوٰتین کے بارے میں سنی شیعہ نزاع چلی آ رہی ہے وہ صرف اس فعل کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں ہے کہ ہم بلا عذر بھی جمع بین الصلوٰتین کو جائز جانتے ہیں جس کی تائید مزید صحاح ستہ کی روایات سے ہوتی ہے۔ جن میں مذکور ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے بعض اوقات مدینہ میں ہر قسم خوف و خطر، طوفان و مطر اور سفر کے بغیر دو نمازوں کو ملا کر پڑھا اور پوچھنے پر فرمایا تاکہ امت کو زحمت نہ ہو۔ اور ہمارے بھائی کسی عذر کے سوا جمع کو جائز نہیں جانتے۔ مگر عام دوسرے مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔ ہماری قوم نے ہر حالت میں جمع بین الصلوٰتین کو اپنا وتیرہ بنا لیا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اگر اس نے دو نمازیں الگ الگ پڑھ لیں تو وہ سنی بن جائیں گے اور ہمارے سنی بھائیوں نے اس جواز سے فائدہ نہیں اٹھایا، اور انھوں نے یہ التزام کر رکھا ہے کہ ہر حالت میں دو نمازوں کو اس طرح علیحدہ علیحدہ پڑھنا ہے کہ اگر انھوں نے کبھی بعد عذر جمع بین الصلوٰتین کر دی تو

وہ شیعہ بن جائیں گے۔ ہم ہر دو فریق کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جمع کرنے سے کوئی سنی شیعہ نہیں بنتا اور علیحدہ علیحدہ پڑھنے سے کوئی شیعہ سنی نہیں بنتا۔ بے شک بلا عذر شرعی بھی جمع بین الصلوٰتین جائز ہے۔ لیکن ہر نماز کو اس کے وقتِ فضیلت پر الگ الگ پڑھنا افضل ہے۔ تفصیل کے لیے ہماری فقہی کتاب "قوانین الشریعہ فی فقہ الجعفریہ" کا مطالعہ کیا جائے۔

اور اس کے دوسرے معنی ہیں: "کتابا مفروضا" کہ نماز اہل ایمان پر فرضِ عین قرار دی گئی ہے۔ جس کے ترک کرنے میں وہ کسی رنگ میں معذور نہیں ہیں۔

(عیاشی وصافی وبرہان)

ولا تھنوا فی......الایۃ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کفار و مشرکین کے ساتھ مقابلہ و مقاتلہ کرنے میں بعض اوقات مُسلمانوں کو سخت تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر خدا مُسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرما رہا ہے کہ ایسی تکلیفیں تو کافروں کو بھی پیش آتی رہتی ہیں۔ مگر اہل اسلام اور اہل کفر میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ مُسلمانوں کے ہاں عقیدہ توحید موجود ہے۔ وہ ہر دکھ درد اور ہر زحمت و مصیبت پر جو انھیں راہ خدا میں پیش آتی ہے خدا سے اجر وثواب کی توقع رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ نہ صرف یہ کہ ان کے لیے مُشکل کو آسان بنا دیتا ہے بلکہ اسے خوشگوار بھی بنا دیتا ہے۔ جبکہ کفار و مشرکین اس عقیدہ سے محروم ہیں۔ اس نمایاں فرق کے باوجود ایک مُسلمان کو بزدلی اور پست ہمّتی کا ہرگز مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہر ہر معاملہ میں بلند ہمّتی اور اولوالعزمی کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

بقیہ: شرک کی مذمت اور اس کی حقیقت

پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے"۔

شرک جلی کی انہی چار قسموں کو (۱) ربوبیت میں شرک اور (۲) الوہیت میں شرک بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی "شرک ربوبی" یہ ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کی تقدیر و تدبیر۔ یعنی ان امور میں شریک قرار دیا جائے جن کا تعلق نظام ربوبیت کے ساتھ ہے جیسے مالکانہ تصرفات کرنا، پیدا کرنا اور رزق دینا وغیرہ اور "شرک الوہی" یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی جائے یا اس سے دعا مانگی جائے (جو کہ مخ عبادت ہے) کیونکہ عبادت و دعا کا حقدار صرف پروردگار ہے جو کہ ایاک نعبدو ایاک نستعین کا مفاد ہے۔

باب الحدیث

عام لوگوں کے ساتھ معاشرتی حقوق کا بیان

تحریر: آیۃ اللہ الشیخ محمد حسین نجفی مدظلہ العالی موسس و پرنسپل جامعہ سلطان المدارس سرگودھا

① جناب...... بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ مسجدوں میں نماز پڑھو اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گواہی دو، اور ان کے جنازوں میں شرکت کرو، عام لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا ضروری ہیں۔ کیونکہ زندگی بھر دوسرے لوگوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ (اصول کافی)

② ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ فرمایا: امانت کو ادا کرو۔ ان کے حق میں بھی اور ان کے برخلاف گواہی دو، وہ اگر بیمار ہو تو ان کی مزاج پرسی کرو۔ اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازوں میں شرکت کرو۔

(اصول کافی)

③ نیز انہی حضرت سے مروی ہے، فرمایا: عام لوگوں کو راضی رکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان کو ان کے خلاف استعمال نہ کرو۔ (اصول کافی)

④ حذیفہ بن منصور بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جعفر صادقؑ سے سنا کہ فرما رہے تھے کہ جو شخص اپنا ایک ہاتھ لوگوں سے روکے (ان کو تکلیف نہ پہنچائے) تو لوگ اپنے بہت سارے ہاتھ اس سے روکیں گے۔ (اصول کافی)

⑤ ابن وہب نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ ہم عام لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ فرمایا: اپنے ائمہ کی پیروی کرو۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں تم بھی وہی کرو۔ بخدا وہ ان کے مریضوں کی عیادت کرتے ہیں، ان کے جنازوں میں شرکت کرتے ہیں اور ان کے حق میں اور ان کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور ان کی امانتیں ادا کرتے ہیں۔ (اصول کافی)

وفیہ کفایۃ لمن لہ ادنی درایۃ

سائل: جناب محسن عباس صاحب ملتان

عزت مآب مجتہد العصر حضرت آیت اللہ محمد حسین نجفی صاحب مدظلہ العالی...... السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ نیاز بے انداز...... عرض خدمت ہے کہ کچھ عرصہ سے مکتب تشیّع اور مکتب تسنّن کی کتب کے مطالعہ سے کچھ سوالات ذہن میں ابھرے ہیں۔ چونکہ جناب کا ایک طویل عرصہ سے معتقد ہوں، آپ کی تقریباً تمام کتب بشمول فیضان الرحمٰن کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں، سوالات کے بعد اپنا مذہبی اور تحقیقی فریضہ سمجھتا ہوں کہ آپ سے رہنمائی لوں، تاکہ صراطِ مستقیم واضح رہے۔ ایک مہربانی کی درخواست ہے کہ جوابات واضح ہوں تاکہ کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

سوال نمبر ۱: ہر منصوص من اللہ چیز (رسالت، کتب، ملائکہ، قیامت) کا انکار کفر ہے۔ اگر ہمارے بارہ ائمہؑ بھی رسالت کی طرح منصوص من اللہ ہیں تو پھر ان کا انکار کفر کیوں نہیں اور ان پر انبیاء کی طرح ایمان لانا واجب کیوں نہیں؟

جواب: باسمہ سبحانہ! رسالت، کتب سماویہ، ملائکہ اور قیامت کا انکار اس لیے کفر ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ کلام مجید میں موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی یاپند یاپند کا رانکار کے (جو کہ مجوسیوں کی آسمانی کتاب ہے) یا دردائیل نامی فرشتہ کا انکار کرے تو یہ کفر نہیں کیونکہ ان کا عام کتابوں میں تذکرہ ہے، قرآن مجید میں یہ نام مذکور نہیں ہیں۔ اسی طرح امامت و خلافت کا اجمالاً قرآن میں تذکرہ ہے مگر تفصیلی نام اس میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان کا تذکرہ کتب تفسیر و حدیث میں موجود ہے لہٰذا اصل خلافت و امامت کا انکار کفر ہوگا۔ مگر مخصوص ہستیوں کی امامت کا انکار کفر نہیں ہے۔

سوال نمبر ۲: ہمارے دو ائمہ حضرت امام محمد تقیؑ اور حضرت امام علی نقیؑ کی منصب امامت سنبھالتے وقت عمر تقریباً تین سال اور آٹھ سال بتائی جاتی ہے۔ کیا اس عمر میں دونوں ائمہ کرام جمعہ، جماعت اور نمازِ عیدین وغیرہ کی امامت خود فرماتے تھے یا ان کی موجودگی کے باوجود کوئی اور غیر معصوم فرد؟

جواب: باسمہ سبحانہ! حضرت امام محمد تقیؑ اور حضرت امام علی نقیؑ جب ظاہری عہدۂ امامت پر فائز ہوئے تو ان کی عمریں قریباً چھ چھ سال کی تھیں۔ اب رہی یہ بات کہ وہ اس عمر میں نمازِ جماعت پڑھاتے تھے یا نہ، یہ علیحدہ بات ہے۔ نص قرآن حضرت عیسیٰؑ نے اپنی ولادت کے تیسرے یا چوتھے دن اعلانِ نبوت کیا تھا کہ وہ نبی ہیں

(انی عبداللہ اتانی الکتاب و جعلنی نبیا) تو اس سوال کی کیا گنجائش ہے کہ وہ جب پنگھوڑے میں آرام کرتے تھے تو نماز با جماعت پڑھاتے تھے یا نہ؟

ویسے جب امام مہدی علیہ السلام ظاہری عہدۂ امامت پر فائز ہوئے تو ان کی عمر پانچ سال تھی۔ اور انھوں نے اسی سن وسال میں اپنے والد ماجد حضرت امام حسن عسکریؑ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی، جیسا کہ کتب تواریخ میں مذکور ہے۔

سوال نمبر۳: ہماری کتب کے مطابق حضرت امام مہدیؑ کی والدہ ماجدہ قیصر روم کی پوتی تھیں۔ ایک جنگ میں بطور کنیز لی گئیں، پھر فروخت ہوئیں وغیرہ وغیرہ۔

☆ حضرت امام حسن عسکریؑ کے زمانہ میں اہل روم سے کون سی جنگ ہوئی؟

☆ اور یہ جنگ کس کس بادشاہ کی افواج کے درمیان لڑی گئی؟

☆ ان کا خوابوں میں نکاح ہوا۔ حضرت محمدؐ نے حضرت عیسیٰؑ سے خواستگاری کی۔ حقیقت کیا ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! حضرت امام مہدی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ جناب نرجس خاتون قیصر روم کے بیٹے یسوعا کی بیٹی تھیں۔ (جن کا سلسلہ نسب جناب شمعون وصی حضرت عیسیٰ تک پہنچتا ہے) بنی عباس کے دور میں اہل روم سے جنگ لڑی گئی جس کے نتیجہ میں جناب نرجس قید ہوکر آئیں۔ اور خوابوں میں حضرت رسولِ خداؐ کا جناب عیسیٰؑ کے توسط سے جناب شمعون سے جناب نرجس کا رشتہ طلب کرنا اور پھر آپ کا ہی عالم خواب میں ان کا امام حسن عسکری سے عقد نکاح پڑھنا روایات میں مذکور ہے۔ (جلاء العیون، غایۃ المقصود)

سوال نمبر۴: دو حجتّ خدا پردہ غیبت میں ہیں۔ ایک حضرت عیسیٰؑ جو آسمان پر ہیں، دوسرے حضرت امام مہدیؑ جو زمین پر ہیں۔

☆ ہمارے زمینی حجتّ خدا یعنی حضرت امام مہدیؑ نے شادی کیوں کرلی؟

☆ کیا پردہ غیب کا اطلاق آپ کے سسرال، اولاد اور اصحاب پر بھی ہوتا ہے اور کیا ان تمام کی غیبت پر ایمان رکھنا ضروری ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! ہمارے زمینی حجتّ خدا نے شادی کیوں کرلی؟ واللہ العالم با لحقائق......اس سلسلہ میں روایات خاموش ہیں کہ شادی کی ہے یا نہ۔ اور اگر شادی کی ہے تو کب اور کس سے کی ہے؟ بہر حال امام مہدی شریعت محمدی کے پیروکار اور مروج ہیں جس میں عقد وازدواج کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ خود نبی تھے اور صاحب شریعت وہ اپنی تکلیف شرعی کو بہتر سمجھتے تھے۔ امام زمانہؑ کی غیبت پر ایمان ضروری ہے۔ کسی اور پر ایمان لانا کہ وہ بھی پردۂ غیبت میں روپوش ہیں ہمارے ایمان کا جزء نہیں ہے۔

سوال نمبر۵: ہمارا عقیدہ ہے کہ حجتّ خدا کے بغیر زمین وآسمان باقی نہیں رہ سکتے۔

☆ حجتّ خدا ہدایت کے لیے ہوتا ہے یا زمین و آسمان کی بقا کے لیے؟

☆ ایک حجتّ خدا آسمان پر تو تھے کیا ان کی وجہ سے

زمین و آسمان باقی نہیں رہ سکتے تھے؟ زمینی حجّت خداوہ بھی پردہ غیب میں ضروری ہے؟

☆ حضرت عیسیٰؑ اور رسولِ پاکؐ کے درمیان تقریباً پونے چھ سو سال کا عرصہ ہے، اس دوران میں زمین پر حجّت خدا کون تھے؟ اگر تھے تو وہ بھی معصوم تھے؟ کیا ان کا مرتبہ انبیاء سے بلند تھا جیسا کہ ہمارے ائمہ کا ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! حجّت خدا کا ایک مقصد یقیناً ہدایت کرنا ہے۔ مگر ان کے تقرر کا مقصد ایک ہی ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان کے وجود کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے زمین کی بقا وجود حجّت کے ساتھ وابستہ کردی ہے۔ ظاہری ہدایت کا سلسلہ لوگوں کی کجروی سے موقوف ہو تو دوسرا مقصد تو حاصل ہو رہا ہے یعنی ؎

قدم سے مہدیٔ دیں کے زمیں قائم ہے پانی پر
قرارِ کشتیٔ دُنیا کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

بنابریں آسمان والوں کے لیے حضرت عیسیٰؑ حجّت ہیں اور باعث امان اور زمین والوں کے لیے امام زمانہؑ اور حضرت پیغمبر اسلامؐ کی آمد تک اوصیاء کے دو سلسلے جاری تھے۔ ایک ملت ابراہیمی کا، دوسرا حضرت عیسیٰؑ کے اوصیاء۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ اوصیا دو قسم کے ہوتے ہیں: ① ایک خاص جس کے لیے نبی کی طرح عصمت ضروری ہوتی ہے ② دوسرے عام جن کے لیے عصمت ضروری نہیں ہے۔ جیسے علماء اعلام جو نائب امام ہوتے ہیں۔

سوال نمبر۶: حضرت علیؑ خلیفہ اول کے زمانہ میں نماز کیسے پڑھتے تھے؟ یا جماعت یا گھر میں؟

☆ اگر با جماعت تو کیا معصوم غیر معصوم کی اقتدا میں کھڑا ہوسکتا ہے؟۔

☆ اگر با جماعت تو کیا معصوم غیر معصوم کی اقتدا میں کھڑا ہوسکتا ہے؟

☆ اگر تقیۃً پڑھتے رہے تو ان کے تقیّہ کا ہمیں کہاں سے علم ہوا؟

☆ بیعت پر تقیّہ کیوں نہ کیا؟

☆ کیا تقیّہ نبی و امام کے لیے جائز ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! گھر میں پڑھتے تھے اور جماعت کے ساتھ کیونکہ اس دور میں با جماعت کی اس قدر اہمیت تھی کہ جو جماعت میں شامل نہیں ہوتا تھا اس کے گھر کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ اور ایسے حالات میں حکم یہ ہے کہ آدمی اپنی اذان و اقامت کہہ کر اور فرادیٰ نماز کی نیت کر کے نمازِ با جماعت میں شامل ہوجائے۔ قیام کے ساتھ قیام اور سجود کے ساتھ سجود۔ نیت کا معاملہ خدا و بندہ کے ساتھ مربوط ہے۔ و انما الاعمال بالنیات۔ معصوم غیر معصوم کی اقتداء نہیں کرسکتا۔ اس کے پیچھے کھڑا ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حکیم الامت امام کے لیے تقیّہ جائز ہے، وہ بہتر جانتے ہیں کہ کس طرح دین کی حفاظت کرنی ہے۔

سوال نمبر۷: اہل سنت کی کس مستند کتاب میں ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا خلیفہ دوئم نے شروع کرایا؟

جواب: باسمہ سبحانہ! علامہ ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب الاوائل میں تصریح کی ہے کہ اسلام میں پہلا

شخص جس نے نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم دیا وہ خلیفہ ثانی تھا۔ (الاوائل ابو ہلال عسکری مخطوط)

سوال نمبر ۸: ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے سے نماز باطل کیوں ہوجاتی ہے؟ اسلامی دلیل کیا ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے کہ "صلوا کما رأیتمونی اصلی" (کتب فریقین) نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ لہٰذا اس کیفیّت اور ہیئت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جائے گی جس طرح آنحضرت ﷺ پڑھتے تھے تو وہ نماز باطل ہی ہوگی۔

سوال نمبر ۹: اگر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا باطل ہے تو پھر حضرت علیؑ نے اس فعل کو کہاں باطل قرار دیا؟ یا مُسلمانوں کی باطل ہونے والی نمازوں پر خاموش رہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! حضرت امیر علیہ السلام اس بدعت پر خاموش نہیں رہے بلکہ بارہا اس کے خلاف آواز بلند کی۔ (ملاحظہ ہو احتجاج طبرسی، بحارالانوار وغیرہ)

سوال نمبر ۱۰: حدیث ثقلین میں قرآن وعترت سے تمسّک کا حکم ہے۔ شیعہ عقیدہ کے مطابق نص قرآن اور عترت رسول سرمن رائے غار یا جزیرہ میں ہیں۔ دونوں معصوم رہنماؤں کی عدم موجودگی میں ہمیں تمسّک رکھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اصل قرآن اور عترت سرمن رائی میں غائب ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل قرآن بھی موجود ہے، صرف ترتیب نزولی کا فرق ہے۔

سوال نمبر ۱۱: غیر معصوم مُجتہدین ہمارے لیے نائب امام اور اولی الامر بنے ہوئے ہیں، قرآنی حکم کے مطابق اگر ان سے اختلاف ہوجائے تو ہم کس کی طرف رجوع کریں؟

جواب: باسمہ سبحانہ! اور امام زمانہ کے عمومی نواب یعنی علماء اعلام بھی موجود ہیں اور ائمہ کے تعلیمات بھی۔ اور اگر ان کے ساتھ اختلاف ہوجائے تو قرآن اور نبی آخر الزمان کا فرمان (جو متفق بین الفریقین ہو......) ارشادِ قدرت ہے: "فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ و الرسول"۔

سوال نمبر ۱۲: اگر کوئی سنی مُسلمان شیعہ ہوجائے تو......

- کیا اسے نمازوں کی قضاء پڑھنی ہوگی؟
- نکاح دوبارہ پڑھنا پڑے گا؟
- اگر وہ غیر سید ہے اور اس کی بیوی سیدہ ہے تو شیعہ ہونے کے بعد سیدہ بیوی سے علیحدگی کرنی پڑے گی یا وہ عقد درست ہوگا؟

جواب: باسمہ سبحانہ! اس صورت میں نہ پڑھی ہوئی نمازوں کا اعادہ کرنا پڑے گا، اور نہ ہی تجدید نکاح کرنا پڑے گی۔ یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر۔ (اور اللہ تعالیٰ تمھاری آسائش چاہتا ہے، تمھاری تکلیف کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔)

سوال نمبر ۱۳: اگر کوئی شیعہ امام مہدی کے ظہور پر ایمان رکھتا ہو مگر ان کی غیبت کا قائل نہ ہو تو کیا وہ شیعہ رہ سکتا ہے؟

جواب: باسمہ سبحانہ! ایسے آدمی مذہب شیعہ سے خارج قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص خدا

باقی صفحہ ۳۹ پر

تحریر: حجۃ الاسلام علامہ ذیشان حیدر جوادی اعلیٰ اللہ مقامہ

دعا کرنا بظاہر اِنتہائی آسان ہے اور واقعاً اِنتہائی مُشکل ہے۔ دنیا کا کون سا انسان ہے جو محتاج نہیں ہے اور کون سا محتاج ہے جو کسی سے طلب نہیں کرتا ہے۔ در حقیقت اسی طلب کا نام دعا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو ناواقف اسرار طلب ہیں وہ محتاجوں سے مانگتے ہیں اور جنھیں طلب کا سلیقہ میسر آتا ہے وہ بے نیاز سے مانگتے ہیں۔ محتاجوں سے مانگنے کا نام خوشامد، تملق، تعریف بے جا، تواضع بے محل اور استدعا و التماس ہے اور بے نیاز سے مانگنے کا نام دعا ہے۔

بے نیاز نے خد کسی کو اپنا نمائندہ بنا دیا ہے تو اس سے مانگنا مذکورہ بالا عناوین سے خارج ہے کہ یہ درحقیقت بے نیاز ہی سے طلب کرنا ہے اور مانگنے والا جانتا ہے کہ یہ افراد اس کے مقابلہ میں حاجت روائی کے دعوے دار نہیں ہیں بلکہ اس کی نمائندگی میں حاجت روائی کا کام انجام دیتے ہیں اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اگر ایک فرشتہ اس کی طرف سے جان لینے پر مامور ہوسکتا ہے تو ایک بندہ جان دینے پر بھی مامور ہوسکتا ہے۔ اس امکان سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کرسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے واقعات کی دنیا الگ ہے اور اس پر بحث کرنے کے لیے بڑی تفصیل درکار ہے۔

دعا جس قدر آسان ہے کہ تقاضائے فطرت، عادت بشر اور مزاج انسانی کے عین مطابق ہے، اسی قدر مُشکل بھی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ سہل ممتنع اگر کوئی چیز ہے تو وہ دعا ہی ہے جو الفاظ کے اعتبار سے انتہائی آسان ہوتی ہے اور اسرار کے اعتبار سے انتہائی مُشکل۔

دعا کے لیے جس قدر آداب درکار ہیں، جو پاکیزگی نفس ضروری ہے اور جس طرح کے تصورات لازم ہیں، اس کا حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دعا مرکز دعا کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت زندگی کا عظیم ترین مرحلہ ہے، جسے مولائے کائناتؑ نے ابتداء دین اور بنیاد مذہب قرار دیا تھا۔ معرفت کے بعد بارگاہ کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا اس سے سخت ترین مرحلہ ہے اور ان تمام مراحل کے بعد طلب میں صدقِ نیت پیدا کرنا اور ایک انتہائی دشوار گزار مرحلہ ہے۔ ورنہ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ مانگنے والا بظاہر خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے رہتا ہے لیکن نظر کسی حاکم کے اقتدار، کسی دولتمند کی جیب،

کسی صاحبِ خیرات کے جود و کرم پر لگی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دعا کا نام دعا نہیں ہے اور گہرائیوں پر غور کیا جائے تو یہ توہین دعا ہے۔ دعا معبود پر اعتماد کا نام ہے اور دوسروں پر نگاہ رکھنا بداعتمادی کی علامت ہے۔

بعض روایات میں تو یہ تک مضمون وارد ہوا ہے کہ اگر کسی شخص کو دعا کی قبولیت پر اعتماد نہ ہو اور وہ صرف حسب عادت یا برائے تجربہ دعا مانگ رہا ہے تو وہ معبود کی توہین کا مُرتکب ہو رہا ہے۔ دنیا کے کسی صاحب کرم کے بارے میں بے اعتمادی اس کے کرم کی توہین، تو معبود کے بارے میں بے اعتمادی کتنی بڑی توہین کا باعث ہوگی، اور تجربہ تو اصلاً حدود اسلام سے باہر ہے۔

بھلا کس بندہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پروردگار سے مانگ کر اس کے کرم کی آزمائش کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔ "تماشائے اہل کرم" دنیا میں دیکھا جاتا ہے، مذہب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کرام نے یہ تاکید کی ہے کہ اپنی دعاؤں میں ائمہ معصومینؑ کے الفاظ کا اتباع کرو اور اس کی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرو کہ تمھارے الفاظ اس کی بارگاہ کے لیے نامناسب ہو سکتے ہیں لیکن ان کے الفاظ میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہ کامل الایمان اور کامل المعرفت تھے، وہ جو الفاظ استعمال کر دیں گے وہ یقیناً بارگاہ کے شایانِ شان ہوں گے۔ اور اس سے مدعا کے حصول کی راہ ہموار ہوگی، بلکہ انہی الفاظ سے انسان اپنے اندر سلیقہ معرفت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ہماری دعائیں نتیجہ معرفت ہیں اور معصومینؑ کی دعائیں درسِ معرفت۔ ہم وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہماری معرفت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور انھوں نے وہ الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہم معرفت باری کی راہیں مُتعیّن کر سکتے ہیں۔ "یا من دل علیٰ ذاتہ بذاتہٖ" (اے وہ معبود جس نے خود اپنی ذات کی طرف رہنمائی کی ہے) کہ وہ خود ہی راہ نما بھی ہے اور منزل بھی۔

یہ جملہ معرفت کا ایک سمندر ہے کہ اگر دعا میں یہ فقرہ نہ آگیا ہوتا تو انسان کے سامنے معرفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ مخلوقات سے خالق کو پہچانے اور کائنات کی عظمت سے مالک کائنات کی بزرگی و برتری کا اندازہ لگائے۔ لیکن امامؑ کے اس ایک فقرہ نے معرفت کا ایک نیا راستہ کھول دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ مخلوقات میں خالق کو پہچنوانے کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو معرفت خود خالق کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مرتبہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہے۔ اس کی طرف اشارہ دعائے صباح میں مولائے کائناتؑ نے کیا تھا، اور اس کے بعد اس کی مکمل تشریح دعائے ابوحمزہ ثمالی میں امام زین العابدینؑ نے کی ہے۔ سرکار سید الشہداء علیہ السلام نے دعائے عرفہ میں اسی حقیقت کی طرف بہت سے اشارے فرمائے ہیں اور معرفت کے بے شمار راستے کھول دیے ہیں۔

دعاؤں کے سلسلہ میں معصومینؑ کے الفاظ و کلمات کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے

مترادف ہے۔ بھلا کس کی مجال ہے جو ان لفظوں کی بلاغت کا اندازہ کر سکے اور اس کے بعد یہ کہے کہ یہ الفاظ اس معرفت کی مکمل ترجمانی کر رہے ہیں یا معبود کی بارگاہ کے شایانِ شان ہیں۔ صاحبانِ بصیرت کے بیان کے مطابق صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس میدان میں جس قدر راہنمائی امام زین العابدینؑ نے کی ہے اور دعا کو جس قدر آپ نے درس و تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے دیگر معصومینؑ کے یہاں اس کی مثالیں نہیں ملتی ہیں اور غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے معصومینؑ کو دوسرے ذرائع بھی فراہم ہو گئے تھے اور انھوں نے ان ذرائع کو بھی درسِ بصیرت اور تبلیغ دین و مذہب کا ذریعہ بنالیا تھا۔ یا بعض اوقات انھیں اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ دعاؤں کے ذریعہ اس کارنامہ کو انجام دے سکتے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا زمانہ واقعہ کربلا کے بعد ایک انتہائی حساس اور دشوار گزار دور تھا۔ اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح کا مُسلّح اقدام ممکن نہیں تھا اور ایک عظیم اقدام کا اثر نظر کے سامنے تھا۔ یعنی مذہب نے اپنی زندگی کے لیے خون کا مطالبہ کیا تھا اور وہ مطالبہ پورا کیا جا چکا تھا۔ انقلابی تحریک کے لیے وہ مقدس خون ہی کافی تھا اس کے لیے مزید قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن امامؑ کے لیے خاموش بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا کہ امام ہدایت خلق کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس لیے آپ نے تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالی کہ یہ صحیح ہے کہ میرا قیام غیر ضروری ہے اور اسلام کو فی الحال میرے خون کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت مظلومیت کے نام پر قوم گوش بر آواز ہے، اور الفاظ کی اتنی سخت گرفت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انھیں الفاظ کے ذریعہ مذہب کی تبلیغ بھی کی جائے اور مظلومیت کی ترویج کا کام بھی انجام دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہ شکل خطبہ ممکن نہیں تھا کہ خطبہ میں مُسلّح اقدام کے اعتراض کے امکانات پائے جاتے تھے اور ایک خونی سانحہ ممکن تھا جس کی اس وقت مشیّت پروردگار کو ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے آپ نے دعاؤں کا راستہ اختیار کیا اور انھیں دعاؤں کے ذریعہ تمام مراحل تبلیغ و ترویج مکمل کر لیے۔

آپ کے الفاظ اس قدر جامع، موثر اور مطابق مقصد و مدعا تھا کہ صاحبانِ حاجت آپ کی دعاؤں پر مکمل اعتماد کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے ایک شاگرد نے آپ کی ایک دعا کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس دعا کے ذریعہ مدعا حاصل نہ ہو تو دعا کرنے والے کو مجھ پر لعنت کرنے کا حق ہے۔ یعنی یہ دعا بارہا کی آزمائی ہوئی ہے اور جب بھی اس کے سہارے مدعا طلب کیا گیا ہے ضرور حاصل ہوا ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ ان پاکیزہ الفاظ کے لیے پاکیزہ زبان اور پاکیزہ قلب فراہم کرے تا کہ اس کے اثرات و نتائج سے بہرہ یاب ہو اور حقیقت یہ ہے کہ اماؑ کی اس دعا کا لہجہ، اسلوب اور انداز اس قسم کا ہے کہ دعا کرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مدعا ضرور حاصل ہوگا۔

خدایا! میں تجھے کیسے پکاروں کہ میری حیثیت معلوم ہے (مَیں مَیں ہوں) اور تجھ سے کس طرح امیدیں

منقطع کروں کہ تیرا کرم بھی معلوم ہے کہ (تُو تُو ہے)

خدایا! مَیں تجھ سے سوال بھی کرتا ہوں تو عطا کرتا ہے، بھلا ایسا کون ہے جس سے سوال کروں تب ہی عطا کرے۔

خدایا! تجھے نہیں بھی پکارتا ہو تو تُو دعائیں قبول کرلیتا ہے۔ اب تیرے علاوہ کون ہے جو مانگنے ہی پر دے دے۔ خدایا! تجھ سے تضرع وزاری نہیں بھی کرتا ہوں تو تُو رحم کردے۔

خدایا! جس طرح تو نے سمندر میں راستہ بنا کر موسیٰؑ کو نجات دی ہے، میری التماس یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر رحمتیں نازل فرما، اور مجھے بھی میری پریشانیوں سے نجات دیدے اور میرے لیے فی الفور سہولت و آسانی کا راستہ کھول دے۔

اے ارحم الراحمین! تجھے تیرے فضل وکرم کا واسطہ۔

ان الفاظ سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان اس اخلاص وصدق نیت کے ساتھ دعا کرے اور اپنے دل میں واقعاً یہ جذبات پیدا کرلے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ہر فرعون وقت کے مقابلہ میں غریب الوطن موسیٰؑ کی طرح صرف ذات واجب پر بھروسا کرلے تو کس طرح ممکن ہے کہ سمندروں میں سے راستہ نہ نکل آئے اور فرعون جیسے ظالموں سے نجات نہ مل جائے اور وہ ظالم غرقاب نہ ہو جائیں۔

آج جب کہ بر و بحر مصائب کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور سمندر سر چشمہ رحمت ہونے کے بجائے سر چشمہ آلام ومصائب بن گئے ہیں ان دعاؤں، ان الفاظ، ان کلمات اور ان معارف وجذبات کی شدید ترین ضرورت ہے۔ رب کریم ہم سب کو اس انداز دعا سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری دعاؤں کو شرفِ قبولیت سے مشرف کرے جن میں سب سے اہم دعا وارث زین العابدینؑ کے ظہور اور قبر زین العابدینؑ کے آبادی کی دعا ہے۔ خدایا! حجّت آخر کے ظہور میں تعجیل فرما اور بقیع کے ویران قبرستان کو آباد فرما۔

باب المتفرقات

قسط:۱

اہل قبلہ کی حرمتِ تکفیر کتاب و سنّت کی روشنی میں

سیّد مزمل حسین نقوی ڈائریکٹر ریسرچ البصیرہ ٹرسٹ اسلام آباد

اسلام نے باہمی روابط کے استحکام اور اجتماعی زندگی کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے۔ قرآن کی نظر میں اتفاق ایک نعمت اور انتشار و پراگندگی ایک عذاب ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ سیاہ ورق ہے کہ باہمی اختلاف کی بدولت سقوط بغداد کا المناک سانحہ پیش آیا اور جس کی وجہ سے امت مسلمہ کو بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس فرقہ پرستی کی لعنت نے مسلمانوں کو کئی دہائیاں پیچھے دھکیل دیا۔ قرآن کے مطابق مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے نہ اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس کی اہانت کرتا ہے۔ اسی طرح امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کی آنکھ اور اس کے لیے آئینہ و راہنما ہے۔ وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس پر ظلم نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور اس کی غیبت نہیں کرتا۔ اسلامی معاشرے میں اتحاد و اتفاق کی فضا اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ہمارا مطمح نظر مادیت کے بجائے روحانیت اور حصولِ دنیا کے بجائے دین کی ترویج ہو۔ مومن کون ہے؟ قرآن اور روایات کی رو سے ایمان اور اسلام کا معیار کیا ہے؟ جو معیار و میزان قرآن و سنت نے بیان کیا ہے اگر کوئی اس پر پورا اترتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ کسی اور عمل کی وجہ سے اسے کافر کہنا غلط ہے۔ یہاں ہم وہ معیار بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مقالے میں اسی معیار کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ لہٰذا مسلمان کو کافر کہنا جائز نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے بھی کہا ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا، بلکہ کسی کو کافر کہنا ہی حقیقت میں کلمہ کفر ہے۔

مقدّمہ:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات اور مل جل کر رہنے کی جتنی تاکید اسلام نے کی ہے کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ باہمی روابط کے استحکام اور اجتماعی زندگی کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں خداوند کریم فرماتا ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

(سورۃ آلِ عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: "اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور آپس

میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں نکال لیا اور اللہ اسی طرح اپنی آیات بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پا جاؤ"۔

ایک اور مقام پر تو خدا نے اسے ایک معجزے کے طور پر بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے:

وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

(سورۃ الانفال: ۶۳)

ترجمہ: "اور ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دی ہے۔ اگر آپ روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی ہے یقیناً وہ ہر شے پر غالب اور صاحب حکمت ہے"۔

اتفاق کو نعمت اور انتشار و پراگندگی کو عذاب قرار دیتا ہے قرآن میں خداوند کریم فرماتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ (سورۃ الانعام: ۴۶)

ترجمہ: "کہہ دیجیے کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ تمھارے اوپر سے یا تمھارے قدموں کے نیچے سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے یا تمھیں فرقوں میں الجھا کر ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں، تا کہ وہ سمجھ جائیں"۔

اس آیت میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ مجرموں کو تین طرح کے عذاب سے ڈرائیں۔ وہ عذاب جو آسمان سے نازل ہوتا ہے، جس طرح آسمانی بجلی کا گرنا، تیز بارش کا آنا، جس طرح قوم نوح پر آئی تھی، دوسرا عذاب جو زمین کی طرف سے ہوتا ہے، مثلاً زلزلہ طوفان وغیرہ اور تیسرا عذاب باہمی اختلاف اور فرقوں میں بٹ جانا۔

اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ اختلاف اس قدر خطرناک ہے کہ اسے صاعقہ یعنی آسمانی کڑک اور زلزلے جیسے ہولناک عذابوں کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض اوقات اختلافات کی وجہ سے اس قدر قتل و غارت ہوئی اور بستی کی بستیاں ویران ہو گئیں ہیں کہ اس قدر اموات تو زلزلے اور آسمانی عذاب سے بھی نہیں ہوئیں۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے احکام سے سرتابی کر کے انسان امن و عافیت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کبھی اوپر سے بجلی کڑک رہی ہے، موسلا دھار بارشیں سیلاب کی صورت اختیار کر کے قیامت ڈھا رہی ہیں۔ کہیں زلزلے آباد شہروں کو کھنڈرات میں بدل رہے ہیں لیکن اس کے علاوہ سخت تر عذاب یہ ہے کہ آپس میں انتشار اور بے اتفاقی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔

ایک قوم کے فرزند اور ایک ملت کے افراد مختلف ٹولیوں اور فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کہیں مذہب وجہ فساد بن جاتا ہے اور کہیں سیاست باعث انتشار۔ اپنوں کی عزت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دینا بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ اوروں کو رہنے دیجیے اپنے گھروں کا حال دیکھیے۔ جب سے ہم نے صراطِ مستقیم سے انحراف کیا ہے تو ہم کن پستیوں میں دھکیل دیے گئے ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کعبہ پر ایمان رکھنے والے کس نفاق اور انتشار کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال زار پر رحم فرمائے۔ آمین''۔ (ضیاء القرآن)

تاریخ اسلام کے اس ورق سے کون آشنا نہیں ہے کہ جب شیعہ وسنی اختلاف کی بدولت سقوط بغداد کا المناک سانحہ پیش آیا، یہ اختلاف اس قدر بڑھ گئے تھے کہ بعض افراد نے ہلاکو خان کو بغداد پر چڑھائی کی دعوت دی۔ اس نے مُسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اہل بغداد پر جو مظالم ڈھائے اور جو سفاکی کی اور جو غارت گری اور خون ریزی روا رکھی اس کی داستان انتہائی المناک ہے۔ بغداد جو تہذیب وتمدّن کا گہوارہ اور مذہبی دنیا کا عظیم ترین شہر تھا کھنڈرات کا ڈھیر بن گیا۔ صدیوں کے محفوظ علمی اور فنی ذخائر یا تو جلا دیے گئے، یا دریا برد کر دیے گئے اور یوں تمدّنی ترقی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

آزاد دائرۃُ المعارف کے مطابق اس حملے میں ایک لاکھ مُسلمان مارے گئے تھے۔ شہر جلا دیا گیا تھا، یہاں تک کہ بغداد کے کتب خانے بھی چنگیزی افواج کے حملے سے محفوظ نہیں رہے۔ بیت الحکمۃ جو کہ بے شمار قیمتی تاریخی دستاویزات اور طب سے لے کر علم فلکیات تک کے موضوعات پر لکھی گئی کتب کا گھر تھا کو تباہ کر دیا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق دریائے دجلہ کا پانی ان کتب کی سیاہی سے سیاہ پڑ گیا جو بہت زیادہ دریا میں پھینک دی گئی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی دنوں تک اس کا پانی سائنسدانوں اور فلسفیوں کے خون سے سرخ رہا۔ وصاف کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کا نقصان کئی لاکھ تھا۔(ur.wikipedia.org)

اس طرح باہمی اختلافات کی وجہ سے امت مُسلمہ کو بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس فرقہ پرستی کی لعنت نے مُسلمانوں کو کئی دہائیاں پیچھے دھکیل دیا۔ اسی لیے خدا اور اس کے رسول نے ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور اخوت و بھائی چارے پر زور دیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ج وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ⑩ (سورۃ الحجرات:۱۰)

ترجمہ: یقیناً مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

کونوا عباد اللہ اخوانا المسلم اخو المسلم لا یظلمہ و لایخذلہ ولا یحقرہ

(مسلم جلد۸ صفحہ ۱۱ طبع دار الفکر بیروت لبنان)

یعنی: ''اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے نہ

اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس کی اہانت کرتا ہے"۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"المسلم اخو المسلم هو عينه و مرأته و دليله لا يخونه و لا يخدعه و لا يظلمه و لا يكذبه و لا يغتابه

(کافی جلد ۲ صفحہ ۱۶۶ طبع تہران)

یعنی: "مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی آنکھ اور اس کے لیے آئینہ و راہنما ہے۔ وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس پر ظلم نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور اس کی غیبت نہیں کرتا"۔

یہ ایک مُسلمہ حقیقت ہے کہ اتحاد و اتفاق باعث خیر و برکت اور اجتماعی عروج و ارتقاء کا موثر ترین ذریعہ ہے، جبکہ افتراق و انتشار تباہی و بربادی اور غربت و افلاس کا پیش خیمہ ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہر دور میں وہی قومیں اپنی عظمت و سطوت کے پرچم لہراتی رہی ہیں جنھوں نے باہمی بغض و عناد اور اختلاف و انتشار سے دور رہ کر اپنی پوری توانائی ملی اور معاشرتی اصلاح کے لیے خرچ کی۔ اس کے برعکس وہ قومیں جو خانہ جنگی کا شکار ہوکر الگ الگ گروہوں میں بٹ گئیں انھیں زندگی کے ہر شعبے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

عالمی منظرنامے میں مُسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کسی بھی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مُسلمان معاشیات، اقتصادیات، سیاست سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں دوسری اقوام سے پیچھے ہیں۔ باہمی اختلافات نے انھیں کھوکھلا کر رکھا ہے۔ تمام تر معدنی ذخائر رکھتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔

اسلام دشمن عناصر اس وقت اپنی پوری قوت و طاقت اس مقصد پر صرف کر رہے ہیں کہ مُسلمانوں کے باہمی اتحاد کو ہر صورت میں روکا جائے اور انھیں مسلکی اور مشربی مسائل میں اس طرح الجھا دیا جائے کہ انھیں ان کے عمل کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ وقتاً فوقتاً نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اور مُسلمان انھیں سمجھے بغیر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔ مُسلمانوں کے باہمی اختلافات کی تشویق ناک صورت حال سے نمٹنے کے لیے باہمی مذاکرات اور افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ قرآنی اور اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسلام نے ہر موڑ پر فرد پر جماعت کو ترجیح دی ہے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو باعث فتح و نصرت قرار دیا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

فان يد الله على الجماعة و ان الشيطان مع من فارق الجماعة (سنن النسائی جلد ۲ صفحہ ۲۹۲ حدیث ۳۴۸۳)

یعنی: "اللہ کا ید رحمت جماعت کے سر پر ہوتا ہے، اور اس کا ساتھی شیطان ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہوجائے"۔

ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ايها الناس عليكم بالجماعة و اياكم و الفرقة

(مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۷۰ طبع بیروت)

یعنی: "اے لوگو! متحد رہو اور تفرقہ سے بچو"۔

اسلامی معاشرے میں اتحاد و اتفاق کی فضا اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب ہمارا مطمحِ نظر مادیت کے بجائے روحانیت اور حصول دنیا کے بجائے دین کی ترویج ہو۔ باہمی بغض وعناد اور بے جا مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہوکر ہم ایمانی رشتۂ اخوت کے بندھن میں بندھ جائیں اور ایک دوسرے کے متعلّق اپنے دل میں دردمندانہ جذبہ پیدا کریں لیکن آج حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہوچکے ہیں۔ خلوص و للّٰہیت ختم ہوچکی ہے، ذاتی مفاد کی خاطر امت کا بڑے سے بڑا نقصان بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلیا جاتا ہے۔ بعض جاہ طلب افراد دنیا طلبی کی خاطر ہمیشہ مذہبی اختلافات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ انھیں امت مُسلمہ کا اتفاق ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اختلاف و انتشار کی آگ بھڑکانے کے لیے اپنی ذہنی و فکری توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ مُسلمانوں کے درمیان نظریاتی اختلاف موجود ہے، جس کی وجہ سے وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے نظریے اور عقیدے پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ خود کو برحق اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ نظریوں کا یہ اختلاف اپنی جگہ لیکن اس کی وجہ سے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ وہ شخص جو خود کو مُسلمان کہتا ہے، خدا کی وحدانیت اور خاتم النبیین کی گواہی دیتا ہے اگر اس کا کوئی نظریہ ہمارے نظریے سے نہیں ملتا اس کے بعض عقائد ہمارے عقائد سے نہیں ملتے تو اسے ہم اسلام سے خارج نہیں کر سکتے۔ اسے لاعلم اور جاہل تو کہہ سکتے ہیں لیکن کافر نہیں کہہ سکتے۔ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ج

(سورۃ النساء: ۹۴)

ترجمہ: "اور جو تم پر سلام کرے اسے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو"۔

اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے چوتھی صدی کے مشہور مُفسّر جصاص کہتے ہیں:

"مُسلمانوں کو رسولِ خدا ﷺ نے ایک جنگ کی طرف بھیجا۔ راستے میں انھیں ایک شخص نظر آیا۔ اس کے پاس بہت سارا مال تھا۔ اس نے ان پر سلام کیا اور کہا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لیکن محلم بن جثامہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب وہ واپس آئے اور رسولِ خدا ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا: اسے کیوں قتل کیا ہے جبکہ وہ اسلام لاچکا تھا۔ محلم نے کہا: اس نے قتل کے ڈر سے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ فرمایا تم نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھا تھا۔ پھر آپؐ نے اس کے وارثین کو دیت ادا کی اور اس کا تمام مال بھی اس کے ورثا کو واپس کر دیا"۔

(احکام القرآن للجصاص جلد ۳ صفحہ ۲۲۳ طبع بیروت)

اس آیت کے ذیل میں مشہور مُفسّر شوکانی کہتے ہیں:

"یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو کسی کافر کو "لا الہ الا اللہ" کہنے کے بعد قتل کرے گا وہ گناہ قتل کا مُرتکب ہوگا۔ کیونکہ یہ جملہ کہنے سے اس کی جان، مال اور اہل و عیال محفوظ ہو گئے ہیں۔ چونکہ رسولِ خدا ﷺ کے دور میں ایسا ہو چکا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ مُسلمان یہ سمجھتے تھے کہ جو قتل

باقی صفحہ ۳۹ پر

باب المتفرقات

علم کے بغیر مناظرہ اور مباحثہ کرنا

تحریر: حجت الاسلام محمد حسینی بہارانچی

قرآن مجید میں علم کے بغیر مباحثہ کرنے کی مذمت وارد ہوئی ہے اور اسے جدال غیر احسن کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے پاس کسی موضوع کے متعلق پوری معلومات نہ ہوں اور برہان شرعی و منطقی سے وہ نابلد ہو اسے مناظرہ اور مباحثہ نہیں کرنا چاہیے۔

سورۂ حج آیت ۸ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ⑧ (سورۃ الحج:۸)

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے علم اور ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر خدا کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

نیز سورۂ حج آیت نمبر ۳ میں ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ (سورۃ الحج:۳)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دعوت و مجادلہ کے اصول بیان کرتے ہوئے سورۂ مبارکہ نحل کی آیت ۱۲۵ میں فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (سورۃ النحل:۱۲۵)

آپ اپنے رب کے راستے کی دعوت دیں حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے احسن انداز میں مباحثہ کریں۔

اہل علم و دانش کا فرض ہے کہ جب دیکھیں کہ انحرافات اور بدعات کو فروغ مل رہا ہے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور حق اور دین خدا کی حفاظت کریں اور اہل باطل سے سرعام مباحثہ کر کے انھیں لوگوں میں لاجواب اور رسوا کریں تاکہ عوام پر ان کی قلعی کھل جائے۔

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اذا ظهرت البدع فعلى العالم ان يظهر علمه والا فعليه لعنة الله

"جب میری امت میں بدعات نمودار ہوں تو عالم پر فرض ہے کہ وہ اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی"۔ (کافی جلد ۱ صفحہ ۵۴)

اسلام کا دفاع کرنے والے علماء کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں کہ اسلام عقل اور منطق کا دین ہے۔ لہٰذا علماء کو بھی چاہیے کہ وہ عقل و منطق سے بھرپور استفادہ کریں اور طالبانِ حقیقت کی رہنمائی کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے فرمایا ہے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

(سورۃ العنکبوت:۴۶)

"اہل کتاب سے احسن انداز میں مباحثہ کرو"۔

مقصد یہ ہے کہ جب اہل کتاب سے مباحثہ کرو تو صحیح استدلال اور منطق و برہان سے انھیں لاجواب کرو۔ اگر تمھارے مباحثے کی اساس صحیح استدلال پر نہ ہوگی تو تم یا تو حق کا انکار کرو گے یا باطل کی تائید کر بیٹھو گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عقائد حقہ میں شکوک و شبہات پیدا ہوجائیں گے۔ لہٰذا جو مسلمان اسلامی عقائد کا بھرپور انداز سے دفاع نہ کرسکتا ہو وہ اہل کتاب سے مناظرہ نہ کرے اور یہی شرط گمراہ مسلمانوں کے ساتھ مباحثہ کی ہے۔ مباحثہ کرنے والے کو بدعت پرست گروہ کی بدعات کا مکمل علم ہونا چاہیے ورنہ ان سے مباحثہ نہ کرے۔

غیر احسن مناظرے کا مفہوم

سید عبداللہ جزائری نے اپنی کتاب تحفۃ السنیہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدیٰ نے مناظرہ سے روکا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہادیانِ دینؑ نے مناظرے اور مباحثے سے مطلق طور پر منع نہیں کیا، البتہ انھوں نے غیر احسن مناظرے سے منع کیا ہے۔

اس شخص نے کہا: فرزند رسول! یہ فرمائیں کہ احسن مباحثہ کیا ہے اور غیر احسن مباحثہ کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: غیر احسن مباحثہ یہ ہے کہ کسی اہل باطل سے تمھاری بحث ہو اور تم اس کے باطل نظریات کی تردید میں خدا کی طرف سے بیان کردہ حجت پیش نہ کرو بلکہ اسے شکست دینے اور نیچا دکھانے کی غرض سے خودساختہ جواب پر قناعت کرو اور اس کے نتیجے میں کسی حق کا انکار کرو۔ ایسا مباحثہ ہمارے شیعوں کے لیے حرام ہے۔ کیونکہ اس سے ہمارے شیعوں کے اعتقاد میں سستی پیدا ہوگی اور ہمارے دشمن اسے اپنے لیے فتح قرار دیں گے اور ایسا مباحثہ ہمارے شیعوں کے دلوں کو مغموم کردے گا۔

اس کے برعکس احسن مباحثہ یہ ہے کہ جو اہل باطل کے مقابلے میں خدا نے انبیاء کو جو دلائل و براہین عطا کیے تھے ان کے ذریعے باطل کا قلع قمع کرنا اور حق کا اثبات کرنا احسن مباحثہ ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لوگوں نے معاد جسمانی کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو یوں بیان کیا ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾ (سورۃ یاسین:۷۸)

اور ہمارے متعلق باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہنے لگا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾

(سورۃ یاسین:۷۹)

(اے رسول!) آپ کہہ دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق

کا علم رکھتا ہے۔

پھر اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ (سورۃ یاسین:۸۰)

وہی جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس (کی ٹہنیوں کو رگڑ کر ان) سے آگ نکالتے ہو۔

حالانکہ سبز درخت اور آگ کا بظاہر کوئی جوڑ ہی نہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لیکن خدا کی قوت یہ ہے کہ اس نے دونوں متضاد اشیاء کو ایک ہی جگہ پر رکھا ہوا ہے۔ پھر فرمایا:

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۱﴾ (سورۃ یاسین:۸۱)

بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کو پھر ویسے ہی پیدا کر دے۔ کیوں نہیں اور وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔

اب آپ نے ملاحظہ کیا کہ جب کفار نے یہ کہا کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلے پیدا کیا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی سوال کے تین جواب دیے ہیں:

① تمھاری نظر میں تخلیق کی ابتدا اس کے اعادہ سے مشکل ہے۔ جو ذات اسے پیدا کر سکتی ہے وہ اسے واپس بھی پلٹا سکتی ہے۔

② اس کی شان قدرت یہ ہے کہ سبز درختوں میں آگ کو پوشیدہ رکھا ہے۔

③ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ بھلا جس نے اتنے بڑے آسمان پیدا کیے اور اتنی وسیع زمین بچھائی کیا وہ انھیں دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

مذکورہ تینوں دلائل کے بعد خدا نے فرمایا کہ وہ کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے علل و اسباب کا محتاج نہیں ہے

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿۸۲﴾

(سورۃ یاسین:۸۲)

جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

اس طرح کے جوابات کو احسن مباحثہ کہا جاتا ہے اور اس سے ہٹ کر اگر کسی اہل باطل کی تردید میں تھیں کسی حق کا انکار کرنا پڑے تو یہ غیر احسن مباحثہ کہلائے گا اور تم میں اور اہل باطل میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ کیونکہ وہ بھی ایک حق کا منکر ہے اور تم بھی حق کے منکر ہو، اس لیے غیر احسن مباحثہ حرام ہے۔

فرمان امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یُحَاسِبُ کُلَّ یَوْمٍ

جو شخص روزانہ اپنا محاسبہ نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(میزان الحکمۃ ۳۸۴۵)

ولادت اور بچپن کا زمانہ

۲۰ جمادی الثانی بروز جمعہ بعثت پیغمبرؐ کے پانچویں سال خانہ وحی میں رسولِ اکرمؐ کی دخترِ گرامی حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا نے ولادت پائی۔ (مناقب ابن شہر آشوب جلد ۳ صفحہ ۳۵۷، بحار الانوار جلد ۴۳ صفحہ ۶، دلائل الامامہ صفحہ ۱۰، اصول کافی جلد ۱) آپ کی والدہ ماجدہ جناب خدیجہؑ بنت خویلد تھیں۔

جناب خدیجہؑ قریش کے ایک شریف و نجیب خاندان میں پیدا اور زیورِ تربیت سے آراستہ ہوئیں۔ ان کے خاندان کے تمام افراد حلیم و اندیشمند اور خانہ کعبہ کے محافظ تھے۔ جب یمن کے بادشاہ تبع نے حجرِ اسود کو مسجد الحرام سے نکال کر یمن لے جانے کا ارادہ کیا تو جناب خدیجہ کے والد خویلد دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کی جنگ اور فداکاریوں کے نتیجہ میں تبع اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ (الروضہ الانف جلد ۱ صفحہ ۲۱۳، منقول از بانوی نمونہ اسلام مُصنّفہ ابراہیم امینی صفحہ ۱۸)

جناب خدیجہؑ کے چچا ورقہ بھی مکہ کے ایک دانشمند اور علم دوست شخص تھے۔ تاریخ کے مطابق جناب خدیجہؑ پر ان کا بڑا اثر تھا۔

والد کے ساتھ

حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہا کی ولادت سے پیغمبر و خدیجہ کا گھر اور بھی زیادہ مہر و محبّت کا مرکز بن گیا۔ جس زمانہ میں پیغمبر اکرم مکہ میں بڑے رنج والم میں مبتلا تھے، اس زمانہ میں پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی نسیم آرام بخش کی طرح ماں باپ کی تھکان کو صبح وشام اپنی محبّت سے دور کرتی تھیں اور رسول اکرمؐ کی پر مُشقت زندگی کے رنج وغم کے دنوں میں تسکین بخش تھیں۔

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کا بچپن، صدر اسلام کے بحرانی اور بہت ہی خطرناک حالات میں گزرا جبکہ رسول خدا سخت مُشکلات اور خطرناک حوادث سے دوچار تھے۔ آپؐ تن تنہا کفر و بت پرستی سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ چند سال تک آپ پوشیدہ طور پر تبلیغ کرتے رہے، جب خدا کے حکم سے آپ نے کُھلّم کھلا دعوت اسلام کا آغاز کیا تو دشمنوں کی اذیت اور ایذا رسانی نے بھی شدت اختیار کر لی۔

جب کفار نے یہ دیکھا کہ اذیت و آزار سے اسلام کی بڑھتی ہوئی ترقی کو نہیں روکا جاسکتا تو انھوں نے ایک رائے ہو کر پیغمبر اکرمؐ کو قتل کر ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔

رسولِ خدا کی جان کے تحفّظ کے لیے جناب ابوطالبؑ نے بنی ہاشم کے ایک گروہ کے ساتھ "شعب ابی طالب" نامی درہ میں آنحضرتؐ کو منتقل کر دیا۔ مُسلمانوں نے تین سال تک اس تپتے ہوئے درہ میں نہایت تنگی، تکلیف اور بھوک کے عالم میں زندگی گزاری اور اسی مختصر غذا پر گزارہ کرتے رہے جو پوشیدہ طور پر وہاں بھیجی جاتی تھی۔

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا تقریباً دو سال تک کفار قریش کے اقتصادی بائیکاٹ میں اپنے پدر عالی قدر کے ساتھ رہیں اور تین سال تک ماں باپ اور دوسرے مُسلمانوں کے ساتھ بھوک اور سخت ترین حالات سے گزریں۔

سنہ بعثت میں "شعب" سے نجات کے تھوڑے دنوں بعد آپ اس ماں کی شفقتوں سے محروم ہو گئیں جنھیں دس سال کی مجاہدت کے رنج وغم خصوصاً اقتصادی ناکہ بندی کی دشواریوں نے رنجور کر دیا تھا۔

(مناقب ابن شہر آشوب جلد ۱ صفحہ ۱۷۴)

ماں کا اٹھ جانا ہر چند کہ جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے لیے رنج اور مصیبت کا باعث تھا اور آپ کی حساس روح کو اس مصیبت نے افسردہ کر دیا تھا لیکن اس کے بعد آپ کو پیغمبر اکرمؐ کے دامن تربیت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا۔

سنہ بعثت میں جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ کی وفات نے روح پیغمبرؐ پر ایسا اثر کیا کہ آپؐ نے اس سال کا نام "عام الحزن" (مناقب ابن شہر آشوب جلد ۱ صفحہ ۱۷۴) (غم واندوہ کا سال) رکھا۔ پیغمبرؐ کے ان دونوں بڑے حامیوں کے اٹھ جانے سے دشمن کی اذیت اور آزار رسانی میں شدت پیدا ہو گئی۔ کبھی لوگ پتھر مارتے، کبھی آپؐ کے روئے مبارک پر مٹی ڈال دیتے، کبھی ناسزا کلمات کہتے۔ اکثر اوقات آپؐ نہایت خستگی کے عالم میں گھر کے اندر داخل ہوتے۔

لیکن یہ فاطمہؑ تھیں جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آپؐ کے سر اور چہرہ اقدس سے گرد جھاڑتیں، نہایت ہی پیار و محبّت سے پیش آتیں اور پیغمبر اکرمؐ کے لیے آرام اور حوصلہ کا باعث بنتیں۔ جناب فاطمہؑ لوگوں کے غصہ اور بے مہری کی جگہ اپنے باپ سے مہر و محبت سے اس طرح پیش آتی تھیں کہ آپؐ کے والد گرامی نے آپ کو "اُمِّ اَبِیہا" کا لقب دیا۔

ہجرت کے کچھ دنوں بعد آٹھ سال کی عمر میں حضرت علیؑ کے ساتھ مکہ سے مدینہ تشریف لائیں، وہاں بھی باپ کے ساتھ رہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے مُشکلات میں حضرت فاطمہؑ برابر شریک رہیں۔ جنگ احد میں جنگ کے خاتمہ کے بعد جناب فاطمہؑ مدینہ سے پیغمبرؐ کے خیمہ گاہ کی طرف دوڑتی ہوئی پہنچیں اور باپ کے خون آلود چہرہ کو دھویا اور آنحضرتؐ کے زخموں کا مداوا کرنے لگیں۔ (بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۸۸)

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا اسلام اور قرآن کے ساتھ ساتھ پروان چڑھیں۔ آپ نے وحی و نبوت کی فضا میں پرورش پائی۔ آپ کی زندگی پیغمبرؐ کی زندگی سے جدا نہیں ہوئی، یہاں تک کہ شادی کے بعد بچوں کے ساتھ بھی آپ کا گھر پیغمبرؐ کے گھر سے مُتصل تھا اور پیغمبر خدا کی ہر جگہ سے زیادہ فاطمہؑ کے گھر رفت و آمد تھی۔ ہر

صبح مسجد جانے سے پہلے آپ فاطمہؑ کے دیدار کو تشریف لے جاتے تھے۔ (کشف الغمہ مطبوعہ تبریز جلد ا صفحہ ۴۵۷)

پیغمبرؐ کے خدمتگار ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسولِ اکرمؐ سفر پر جانا چاہتے تو آپؐ سب سے آخر میں فاطمہؑ سے وداع ہوتے تھے اور جب سفر سے واپس آتے تھے تو سب سے فاطمہؑ کے پاس جاتے تھے۔

(کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ جلد ا صفحہ ۴۵۷)

آخر کار پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے آخری لمحات میں بھی فاطمہؑ ان کی بالین پر موجود گریہ فرما رہی تھیں۔ پیغمبرؐ ان کو یہ کہہ کر دلاسہ دے رہے تھے کہ وہ ہر ایک سے پہلے اپنے باپ سے ملاقات کریں گی۔

(امالی طوسی جلد ۲ صفحہ ۱۴)

حضرت فاطمہؑ کی شادی

سنہ ۲ھ میں پیغمبر اکرمؐ نے امیرالمومنین علیؑ سے فاطمہؑ کی شادی کردی۔ (جناب معصومہ کی شادی کی تاریخ میں اختلاف ہے سید ابن طاؤس نے مرحوم شیخ مفید کی کتاب حدائق الریاض میں اقبال کے مطابق ازدواج کی تاریخ ۲۱ محرم ۳ھ نقل کی ہے لیکن مصباح میں اول ذی الحجہ مانتے ہیں۔ امالی میں آیا ہے: فاطمہؑ کی شادی عثمان کی بیوی رقیہ کی وفات کے سولہ دن بعد اور جنگ بدر سے واپسی پر ہوئی۔ بحار جلد ۴۳۔۹۳۔۹۷)

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خوشگوار رشتہ انھیں کے لائق تھا۔ اس لیے کہ معصومینؑ کی تصریح کے مطابق حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی بھی فاطمہؑ کا کفو اور ہمسر نہیں ہوسکتا تھا۔

اس شادی کی خصوصیتوں میں سے یہ بات بھی ہے جو ان دونوں بزرگ ہستیوں کی بلند منزلت کا ثبوت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے قریش کے صاحب نام افراد، بڑی شخصیتوں اور ثروت مندوں کی خواستگاری کو قبول نہیں کیا آپؐ فرماتے تھے کہ فاطمہؑ کی شادی کا مسئلہ حکم خدا سے متعلق ہے۔ ("امرھا الی ربھا" کشف الغمہ جلد ا صفحہ ۳۵۳ مطبوعہ تبریز، بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱)

رسولِ خدا نے فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کو علیؑ کے لیے روکے رکھا تھا اور آپؐ خدا کی طرف سے مامور تھے کہ نور کو نور سے ملادیں۔ (دلائل الامامہ صفحہ ۱۹)

اسی وجہ سے جب حضرت علیؑ نے رشتہ مانگا تو پیغمبر اکرمؐ نے قبول فرمایا اور کہا: تھارے آنے سے پہلے فرشتۂ الٰہی نے مجھے حکم خدا پہنچایا ہے کہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شادی علیؑ سے کردو"۔ (بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱۲۷)

رسول اکرمؐ نے جناب فاطمہؑ کی رضایت لینے کے بعد حضرت علیؑ سے پوچھا کہ شادی کرنے کے لیے تھارے پاس کیا ہے؟ آپؑ نے عرض کیا: ایک ذرہ، ایک شمشیر اور پانی لانے کے لیے ایک شتر کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ علیؑ نے پیغمبرؐ کے حکم کے مطابق ذرہ بیچ دی اور اس کی قیمت سے جو تقریباً پانچ سو درہم تھی، جہیز کا معمولی سامان خرید ا گیا ضیافت بھی ہوئی اور مُسلمانوں کو کھانا بھی کھلایا گیا۔ مسرت و شادمانی اور دعائے پیغمبرؐ کے ساتھ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو علیؑ کے گھر لے جایا گیا۔ (کشف الغمہ مطبوعہ تبریز جلد ا صفحہ ۳۶۰۔ ۳۶۹، بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱۲۷، ۱۳۳)

فاطمہ علیؑ کے گھر میں

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا باپ کے گھر سے شوہر کے گھر اور مرکز نبوت سے مرکز ولایت

میں منتقل ہوگئیں۔ اور اس نئے مرکز میں فاطمہ سلام اللہ علیہا کے کاندھوں پر فرائض کا گراں بار آ گیا۔

آپ چاہتی تھیں کہ اس مرکز میں ایسی زندگی گزاریں کہ جو ایک مسلمان عورت کے لیے مکمل نمونہ بن جائے تاکہ آئندہ زمانہ میں ساری دنیا کی عورتیں آپؑ کے وجود اور آپؑ کی روش میں حقیقت و نورانیت اسلام دیکھ لیں۔

گھر کے محاذ میں جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے کردار کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کے لیے ایک مفصل کتاب کی ضرورت ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر یہاں چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(ا گھر کا انتظام:

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اگرچہ بڑے باپ اور عظیم پیغمبرؐ کی نورِ چشم تھیں اور کائنات میں ان سے بڑی شریف زادی کا وجود نہیں تھا لیکن ان باتوں کے باوجود آپ گھر میں کام کرتی تھیں اور گھر کے دشوار کاموں سے بھی انکار نہیں کرتی تھیں۔

گھر کے اندر آپ اتنی زحمت اٹھاتی تھیں کہ علیؑ بھی ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت علیؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ میں اپنی اور فاطمہؑ کی حالت تم کو بتاؤں؟

آپ گھر کے لیے اتنا پانی بھر کر لاتی تھیں کہ آپ کے جسم پر مشک کا نشان پڑ جاتا تھا اور اسی قدر چکیاں چلاتی تھیں کہ ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے تھے، گھر کو صاف ستھرا رکھنے، روٹی اور کھانا پکانے میں اتنی زحمت برداشت کرتی تھیں کہ آپ کا لباس گرد آلود ہو جاتا تھا۔ (بحارالانوار جلد ۴۳ صفحہ ۸۲)

جناب سیدہؑ نے گھر کو حضرت علیؑ اور اپنے بچوں کے لیے مرکز آسائش بنا دیا تھا، اس حد تک کہ جب حضرتؑ پر رنج و غم، دشواریوں اور بے سروسامانیوں کا حملہ ہوتا تھا تو آپؑ گھر آجاتے اور تھوڑی دیر تک جناب فاطمہؑ سے گفتگو کرتے تو آپؑ کے دل کو اطمینان محسوس ہونے لگتا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ علیؑ گھر کی ضرورت کے لیے لکڑی اور پانی مہیا کرتے، گھر میں جھاڑو دیتے اور فاطمہ چکی پیستیں اور آٹا گوندھ کر روٹی پکاتی تھیں۔ (بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱۵۱ منقول از کافی ...... کان امیرالمومنینؑ یحتطب و یستقی و یکنس و کانت فاطمةؑ تطحن و تعجن و تخبز)

ب شوہر کی خدمت

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا وہ بی بی ہیں جنھوں نے غریب لیکن انتہائی با فضیلت انسان کے ساتھ عقد فرمایا۔ انھوں نے ابتدا ہی سے اسلام اور اپنے شوہر کے حساس حالات کو محسوس کر لیا تھا، وہ جانتی تھیں کہ اگر علیؑ کی تلوار نہ ہوتی تو اسلام کو اتنی پیش قدمی حاصل نہ ہوتی اور یہ بھی جانتی تھیں کہ اسلام کا بہادر سپہ سالار اس صورت میں میدانِ جنگ میں کامیاب ہو سکتا ہے جب گھر کے داخلی حالت کے اعتبار سے اس کی فکر آزاد اور وہ بیوی کی مہر و محبت اور تشویق سے مالا مال ہو۔ جب علیؑ میدانِ جنگ سے تھک کر واپس آتے تھے تو ان کو مکمل طور پر بیوی کی مہربانیاں اور محبتیں ملتی تھیں۔ حضرت فاطمہ سلام

اللہ علیہا ان کے جسم کے زخموں کی مرہم پٹی کرتیں اور ان کے خون آلود لباس کو دھوتی تھیں۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ جنگ احد سے واپس لوٹے تو انھوں نے اپنی تلوار فاطمہؑ کو دی اور فرمایا اس کا خون دھو ڈالو۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۱۰۶، الصحیح من سیرۃ النبیؐ جلد ۴ صفحہ ۳۲۴، بحار جلد ۲ صفحہ ۸۸)

آپؑ زندگی کی مشقتوں میں حضرت علیؑ کی ہم فکر اور ان کی شانہ بشانہ تھیں۔ آپ ان کے کاموں میں ان کی مدد کرتیں، ان کی تعریف اور تشویق فرماتیں، ان کی فداکاری اور شجاعت کی ستائش کرتیں اور ان کی کوششوں اور زحمتوں کے سلسلہ میں بڑی فرض شناس تھیں۔ پوری زندگی میں کوئی موقعہ بھی ایسا نہیں آیا کہ جس میں آپ نے اپنے شوہر سے دل توڑنے والی کوئی بات کہی ہو یا ان کے دل کو رنج پہنچایا ہو، بلکہ ہمیشہ آپ اپنی بے لاگ محبّت و عنایت سے ان کی دکھی روح اور تھکے ماندہ جسم کو تسکین دیتی رہی ہیں۔ حضرت علیؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"جب میں گھر آتا تھا اور میری نظر فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا پر پڑتی تو میرا تمام غم و غصہ ختم ہو جاتا تھا"۔

(مناقب خوارزمی صفحہ ۲۵۶)

جب آنحضرتؐ نے علیؑ سے سوال کیا تھا کہ آپ نے فاطمہؑ کو کیسا پایا؟ تو آپؑ نے جواب میں فرمایا تھا کہ "فاطمہ اطاعت خداوند عالم میں میری بہترین مددگار ہیں"۔ (بحار الانوار جلد ۴۳ صفحہ ۱۱۱...... نعم الصون علی طاعة الله)

ج تربیت اولاد:

جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت تھی۔ آپ کو خداوند عالم نے پانچ اولادیں عطا کی تھیں، حسنؑ حسینؑ، زینبؑ، ام کلثومؑ اور مُحسنؑ۔ پانچویں فرزند جن کا نام مُحسن تھا وہ سقط ہو گئے تھے۔ آپ کے تمام بچے پاکباز، بااخلاص اور خدا کے مُطیع تھے۔ جناب فاطمہؑ نے ایسے اولاد کی پرورش کی کہ جو سب کے سب اسلام کے محافظ اور دین کی اعلیٰ اقدار کے نگہبان تھے کہ جنھوں نے اس راستہ میں اپنی جان دینے کی حد تک مقاومت کا مظاہرہ کیا۔ ایک نے صلح کے ذریعہ اور دوسرے نے اپنے خونیں انقلاب سے نہال اسلام کی آبیاری کی اور دین کی اسلام کو بچالیا۔ (یہ حصّہ کتاب "بانوی نمونہ اسلام" مُصنّفہ ابراہیم امینی کا اقتباس ہے)

ان کی بیٹیوں نے بھی خاص کر واقعہ کربلا میں اپنے بھائیوں کی آواز اور امام حسینؑ کے پیغام کو کوفہ، شام اور تمام راستوں میں دوسروں تک پہنچایا۔

جناب فاطمہؑ کی معنوی شخصیت

تمام عورتوں کی سردار، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی معنوی شخصیت ہمارے ادراک اور ہماری توصیف سے بالاتر ہے۔ یہ عظیم خاتون کہ جو معصومینؑ کے زمرہ میں آتی ہیں ان کی اور ان کے خاندان کی محبّت و ولایت دینی فریضہ ہے اور ان کا غصہ اور ناراضگی خدا کا غضب اور اس کی ناراضگی شمار ہوتی ہے۔ (بحار الانوار جلد ۳۴ صفحہ ۱۹ و ۲۶، کشف الغمہ جلد ۱ صفحہ ۴۵۸ طبع تبریز، الغدیر جلد ۳ صفحہ ۲۰)

ان کی معنوی شخصیت کے گوشے ہم خاکیوں کی گفتار و تحریر میں کیونکر جلوہ گر ہو سکتے ہیں؟

اس بنا پر فاطمہؑ کی شخصیت کو معصوم رہبروں کی زبان سے پہچاننا چاہیے۔ اور اب ہم آپ کی خدمت میں جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں ائمہ معصومینؑ کے چند ارشادات پیش کرتے ہیں۔

(۱) پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: جبرئیل نازل ہوئے اور انھوں نے بشارت دی کہ: ''...... حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور فاطمہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں''۔ (امالی مفید صفحہ ۳، امالی طوسی جلد ۱ صفحہ ۸۳، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۳ صفحہ ۳۲۲)

(۲) آنحضرتؐ نے فرمایا: دنیا کی سب سے برتر چار عورتیں ہیں: مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہؑ دختر محمدؐ اور آسیہ دختر مزاحم (فرعون کی بیوی)
(بحار جلد ۴۳ صفحہ ۹ و ۲۶......مناقب ابن شہر آشوب جلد ۳ صفحہ ۳۲۲)

(۳) آپؐ نے یہ بھی فرمایا: خدا فاطمہؑ کی ناراضگی سے ناراض اور ان کی خوشی سے خوشنود ہوتا ہے۔
(بحار جلد ۴۳ صفحہ ۹، کشف الغمہ جلد ۱ صفحہ ۴۶۷)

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر خدا امیر المومنینؑ کو خلق نہ کرتا تو روئے زمین پر آپ کا کوئی کفو نہ ہوتا۔ (بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱۹ و ۲۶)

(۵) امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا کہ: حضرت فاطمہؑ کا نام ''زہرا'' یعنی درخشندہ کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ: جب آپ محراب میں عبادت کے لیے کھڑی ہوتی تھیں تو آپ کا نور اہل آسمان کو اسی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا کہ جس طرح ستاروں کا نور، زمین والوں کے لیے جگمگاتا ہے۔

(بحار جلد ۴۳ صفحہ ۱۲، علل الشرائع مطبوعہ قم صفحہ ۱۸۱، قال سئلت ابا عبداللہ عن فاطمۃ لم سمیت زھراء فقال: لانھا کانت اذا اقامت فی محرابھا زھر نورھا لاھل السماء کما یزھر نور الکواکب لاھل الارض)

پیغمبر اکرمؐ نے فاطمہؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''جو انھیں پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا (وہ پہچان لے کہ) یہ فاطمہؑ محمدؐ کی بیٹی ہیں، یہ میرے جسم کا ٹکڑا اور میرا قلب و روح ہیں، جو ان کو ستائے گا وہ مجھے ستائے گا اور جو مجھے ستائے گا وہ خدا کو اذیت دے گا''۔ (کشف الغمہ مطبوعہ تبریز جلد ۱ صفحہ ۴۶۷،

......من عرفھذہ فقد عرفھا و من لم یعرفھا فھی فاطمۃ بنت محمد صلعم و ھی بضعۃ منی و ھی قلبی الذی بین جنبی فمن آذاھا فقد آذانی و من آذانی فقد آذی اللہ)

فاطمہؑ باپؐ کے بعد

پیغمبر اکرم ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سر اقدس حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور حضرت فاطمہؑ اور حسن و حسین علیہم السلام آپؐ کے چہرۂ اقدس کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے، آپؐ کی آنکھیں بند اور زبان حق خاموش ہو چکی تھی اور روح عالم ملکوت کو پرواز کر چکی تھی، رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے سبب حضرت فاطمہ زہراءؑ پر سارے جہاں کا غم و اندوہ ٹوٹ پڑا، فاطمہؑ جنھوں نے اپنی عمر کو مصیبت و آلام میں گزارا تھا اور تنہا ان کی دلی مسرت باپ کا وجود تھا، اس تلخ حادثہ کے پیش آنے کے بعد آپ کی سب امیدیں اور آرزوئیں تمام ہو گئیں۔

☆

اقتباس از تاریخ اسلام

باب المتفرقات

اسلام کا مقصد حکمرانی و نظریہ جہانبانی

قسط: ۱

از عالیجناب صدر المحققین مولانا السید محمد رضی قبلہ زنگی پوری اعلیٰ اللہ مقامہ

سلطنت و حکومت غایت ہے یا وسیلہ؟ اس سوال کے مختلف جوابات ملے ہیں، جن کی بنا خیالات کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ سلطنت و حکمت مقصود بالذات ہے، اور انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد اور برترین نصب العین ہے۔ انسانیت کا کمال جہانبانی و حکمرانی ہے۔ جس خوش نصیب کو یہ سعادت مل گئی وہ انسانیت کے معراج کمال پر پہنچ گیا۔ یہ نظریہ قدمائے حکماء کی طرف منسوب ہے۔

اس نظریے کے مقابل دوسرا نظریہ ہے جو اس دور نادانی میں انگریز و امریکن مصنّفین کی جانب منسوب کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلامی حکومت کا نصب العین ہے اور اس سے پہلے بھی انبیاء و رسل کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آنے والی ربانی سلطنتوں کا مقصد اعلیٰ رہ چکا ہے۔

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطنت و جہانبانی، ریاست و حکمرانی غایت نہیں بلکہ وسیلہ ہے، عالم انسانیت میں اخلاقی بنیادوں پر نظام اجتماع و معاشرت کی تشکیل کرنا، عالمگیر برادری و قومیت کو وجود میں لانا بنی نوع انسان کے اندر علم و حکمت، عدل و داد کی روشنی پھیلانا، معیشت دنیوی کو اخلاقی قدروں پر قائم کرنا، دنیا کی زندگی کی حیات اخروی سے وابستگی کا فلسفہ سمجھانا، حق و انصاف کو تمدّن کی بنیاد قرار دینا، انسانی خصوصیات کو ابھارنا، اور حیوانی جذبات کو تابع عقل بنانا انسان میں جوہر انسانیت پیدا کر کے بزم کائنات میں اس کی خداداد شرافت و فضیلت کو برقرار رکھنا، حکومت و ریاست کا اساسی نصب العین ہے۔ عالم انسانیت کی بہتری کے لیے جدوجہد اور نوع بشر کے حال و مستقبل کی اصلاح کی طرف صحیح رہنمائی سلطنت کی اصل غایت قرار دیتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے عالم انسانیت میں قائم ہونے والی خلافتوں اور ربانی حکومتوں کا یہی نظریہ رہا ہے، جس کی تکمیل و توسیع حکومت اسلام کے ذریعہ سے کی گئی۔

زمانہ حاضرہ میں دنیا کی تمام قوموں کا مشترک بنیادوں پر ایک جتھا قائم کرنے کی تمنا مہذب یورپ اور روشن خیال امریکہ کے ارباب سیاست و تدبیر کے دلوں میں کروٹیں لے رہی ہے اور اس کا ابتدائی ظہور کبھی "لیگ اقوام" اور کبھی "اقوام متحدہ" کے ایسے عالمی اداروں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان ملکوں کے ہوشمند و بیدار مغز افراد اس حقیقت کا بھی احساس کرنے لگے ہیں

کہ دنیا میں جتنے نظامات معیشت وحکومت رواج پذیر ہیں وہ سب کے سب ناقص اور تنگ نظری پر مبنی ہیں۔ عالم انسانیت کی بہتری و بہبودی کے لیے کافی نہیں۔ ان سے زیادہ وسیع، جامع وہمہ گیر نظام کی دنیا کو ضرورت ہے۔ جو قومیت و وطنیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ مشترکہ انسانیت اور اخلاق کی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہو۔

پروفیسر کو بن لکھتا ہے:

اب صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ عقل کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد بھی ہے جس پر ہم قانون حکومت کی دوبارہ تشکیل کرسکیں؟ اگر دنیا میں کوئی عالمگیر مذہب ہوتا تو اس کے آسمانی قوانین پر جدید نظام حکومت کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی۔

ہمارے اس کہنے سے کہ کیا کوئی ایسا قانون ہے جو انسانی فطرت کے اندر ہو، مطلب دراصل یہ ہے کہ کیا کہیں کوئی ایسا ضابطہ اخلاق ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے قابل قبول ہو...... اگر کہیں کوئی ایسا ضابطہ ہے تو وہی نظام فطرت انسانی بن سکتا ہے۔

(منقول از معارف القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۰۷)

پروفیسر صاحب کے سامنے چونکہ حقیقی اسلام نہیں ہے، اور نہ آج دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اس کے سامنے اسلام کو اصلی صورت اور صحیح خط وخال میں پیش کرسکے۔ اس لیے انھیں کوئی عالمگیر مذہب دکھائی نہیں دیا، ورنہ ان کا طرز فکر وخیال کچھ اور ہوتا۔ اسلام سے اس ناواقفیت میں پروفیسر صاحب کا قصور نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہے۔ کسی مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنا اس کے پیروؤں ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے خود مسلمانوں کے حلقوں میں اسلام کا اثر بہت قلیل عرصہ میں مائل بہ انحطاط وزوال ہوگیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شاہ اسماعیل صاحب "رسالہ منصب امامت" میں لکھتے ہیں:

از ابتدائے زمان خلافت راشدہ تا زمانہ انقضا این سلطنت کاملہ زمانہ ترقی اسلام است۔ نانچہ در حدیث شریف وارد شدہ تدور رحی الاسلام لخمس و ثلاثین اوست و ثلاثین اوسبع و ثلاثین۔ صفحہ ۸۰

"خلافت راشدہ کی ابتدا کے زمانہ سے اس سلطنت کاملہ کے زمانے کے گزرنے تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اسلام کی چکی ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ برس پھرے گی"۔

اس کلام سے معلوم ہوا کہ ترقی اسلام کا صرف ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال تھا۔ اس کے بعد اسلام کے لیے تنزل و انحطاط کا زمانہ آگیا اور وہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں شکست خوردہ ہوگیا۔ مسلمان جس قدر وسیع وعظیم فتوحات اور دنیوی عروج پاتے گئے اسلام کے روحانی اصول اور اخلاقی اقدار کو شکست ملتی گئی۔ ارباب حکومت وارکان دولت کے حلقوں میں اسلام کا صرف نام تھا، کام اسلامی نہ تھے۔ وہ اسلامی نظریات واصول کی بساط پر نہیں بلکہ قیصر وکسروی مسندوں پر متمکن تھے۔ زمانہ حال کے نامور فاضل مولانا حامد انصاری صاحب غازی لکھتے ہیں:

"سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عصر ظہور (۵۷۱ء) سے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے دور تک

اسلامی حکومت کا حقیقی اور اصلاحی دور ہے۔ اس عرصہ میں اسلام کی حکمبرداری کے قوانین حاکمیّت کے اصول اور حکومت کے طرز سے دنیا کو مکمل طور پر تعارف حاصل ہوا"۔

(اسلام کا نظریہ حکومت)

حکومت اسلام کے اس مختصر عہد میں بھی حکمران طبقے کے طرزِ حکومت سے عوام مسلمین کا جو خیال تھا اس کی مختصر روئداد جناب ابوایوب انصاریؓ کی زبانی سنیے:

عباد الله الیس انما عهدکم بالجور و العدواب بالامس و قد شمل العباد و شاع فی الاسلام فذوحق محروم و مشتوم عرضه و مضروب ظهره و ملطوم وجهه و موطوء بطنه و صلقی بالعراء فلما جائکم امیرالمومنین صدع بالحق و نشر العدل و عمل بالکتاب فاشکروا نعمة الله علیکم و لا تقولوا مجرمین

(امامت و سیاست ابن قتیبة صفحه ۱۲۸ مطبوعه مصر)

بندگانِ خدا! کیا ابھی کل کی بات نہیں ہے کہ تم ظلم و جور کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے جو تمام بندگانِ خدا کو اپنے لپیٹ میں لیے ہوئے تھا، اور اسلامی دنیا میں عام طور سے پھیل گیا تھا۔ حقدار محروم کیا جا رہا تھا، اس کی آبرو پر سب و شتم ہوتا تھا اور پیٹھ پر مار پڑتی تھی اور اس کے چہرہ پر طمانچے لگائے جاتے تھے اور اس کے پیٹ کو پاؤں سے روندا جاتا تھا اور وہ بے بس کھلے چٹیل میدان میں پڑا تھا۔ جب امیرالمومنین علیؑ تمھارے درمیان آئے تو حق کے ڈنکے بجنے لگے۔ آپ نے عدل کو پھیلایا، کتاب خدا پر عمل کیا۔ پس جو نعمت خدا تم کو ملی ہے اس پر شکر خدا کرو اور مُنھ پھیر کر (کفرانِ نعمت کے) مجرم نہ بنو۔

ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فاروق ایم اے پی ایچ ڈی نے ایک مفصل مضمون "ابان کا ماحول اور شاعری" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ شاعر خلیفہ ہارون رشید اور اس کے برمکی وزراء کا ہمعصر تھا۔ اس عہد میں ابان نے جو ماحول پایا تھا ممدوح نے اس کی تصویر اس بیان میں کھینچی ہے:

"یہ شاہی استبداد کا زمانہ تھا جس کی گود میں ایک غیر متوازی نظام اجتماعی اور اقتصادی پل بڑھ رہے تھے۔ حکومت کی دولت ہر طرف سے سمٹ کر محلوں میں آجمع ہوتی یا ممتاز خاندانوں بنوہاشم و بنوامیہ وغیرہ میں بٹ جاتی، اور پھر نفس پرستی کے کام آتی۔ اس نفس پرستی کی بہت سی شکلیں تھیں۔ یہ نفس پرستی نقاب پوش تھی۔ اس کا ظاہر ثقہ اور صالح تھا، اس کے نیچے شیطان کے جلوے تھے۔ اس کو خدا و رسول کی طرف سے جائز قرار دیا جاتا تھا حالانکہ خدا اور رسول اس سے بری تھے۔ اس کی تفصیلات سے تاریخ و ادب کی کتابیں پر ہیں۔ بہترین کنیزیں بہترین غلام بہترین مکان بہترین کھانے بہترین لباس اور بہترین اقتدار و رسوخ رقص و سرود زندی و مستی اور ان کے لیے اندھادھند جد و جہد خوف خدا اور راستبازی سے بالکل بے نیاز اس نفس پرستی کے بہترین خدوخال تھے۔ خلفاء اور ان کے قریبی رشتہ داروں کے محل جہاں دولت امنڈتی تھی اس نفس پرستی سے بھرپور تھے، جہاں دولت کا دریا اتنی طغیانی سے نہ بہتا وہاں اس کو مکمل بنانے کی سرگرمیاں تھیں۔ جو لوگ دولت سے محروم یا محروم ہونے کے برابر تھے اور اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ تھے وہ مایوس ہو کر یا تو زہد و قناعت کا مصنوعی لبادہ پہن کر ان کا پرچار اور دولت و مال کی مذمت اپنا شعار بنا لیتے اور ایسے بہت کم تھے یا نفس پرستی

کا سودا سر میں بھر کر جرائم کرنے لگتے یا اپنی قابلیتوں کو بیچنے لگتے اور امیروں کی مدح سرائی کو اپنا پیشہ بنا لیتے اور ان کے انعام و اکرام سے نفس پرستی کے محبوب کو حاصل کرتے۔ یہ زمانہ شاہی استبداد اور اقتصادی عدم توازن کے ساتھ ساتھ جنسی عدم توازن کا بھی تھا۔ جب جنسی خواہشات اور ان کے حصول کے ذریعے بالکل بے قید تھے۔ کیونکہ جس کے پاس روپیہ ہوتا جنسی خواہش کے ہر جذبے کو ہر حد تک پورا کر سکتا تھا۔ خوبصورت کنیزیں ہر جگہ دستیاب تھیں۔ ایسے ادارے ہر بڑے شہر میں تھے جہاں ان کو ادب، شوخی و سنگی اور گانے کی تعلیم دے کر بیچا جاتا تھا۔ سرمایہ دار کنیزوں کے رقص و سرود اور جسموں کی تجارت کرتے تھے جہاں شعرا، زندہ مزاج، رنگیلے اور گانے کے عاشق خاص طور پر آتے جاتے۔ یہی نہیں خوبصورت امرد غلاموں سے عشق و محبت اور غیر فطری حظ کوشی بھی ہوتی تھی اور بہت سے بڑے گھروں میں کنیزوں کے ساتھ ساتھ ان کے طائفے بھی آباد تھے۔ یہ زمانہ شراب رقص اور گانے بجانے سے بڑھی ہوئی دلچسپی کا زمانہ تھا۔ جب ہارون الرشید جیسے نماز گزار خلیفہ نے سازندوں کا پورا ایک سلسلہ قائم کیا تھا اور لاکھوں درہم ان پر صرف ہوتے تھے، اس نفس پرستی کے سامنے اخلاقی و دینی قدریں شل ہو گئی تھیں۔ وہ اگر کسی دل میں حرکت کرتی بھی تھیں تو درباری نفس پرستی کا بھاری بوجھ انھیں دبا کر پھر ساکت کر دیتا۔ یہ اگر کسی کے لب تک آئیں تو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہوتیں''۔

(ندوۃ المصنفین کا علمی رسالہ برہان جنوری ۱۹۵۰ء)

مسلمانوں نے جو طرز جہانبانی اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا اسلامی حکومت کی برکات کا تجربہ نہ کر سکی۔ اسلام کے اصول حکمرانی و مقاصد سلطنت جو عام انسانیت میں خدا کی بہت بڑی رحمت تھے تاریکی میں رہ گئے۔ دنیا کی نگاہوں نے مسلمانوں کے جس طور طریقے کو دیکھا اسی کو اسلامی طریقہ سمجھ لیا اور اسلامی حکومت کی طرف سے عام غلط فہمی و بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اسلام جن برائیوں کو دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا بدقسمتی سے وہی ناواقف دنیا کے نزدیک اسلامی اصول اور اسلامی مقاصد تصور کی جانے لگیں۔

جس طرح عیسائی دنیا کے مذہبی رہنماؤں نے مذہب کے نام پر حکومت کے جابرانہ طریقے اختیار کیے اور ان کی بدولت عوام نہ صرف مذہبی رہنماؤں سے بلکہ اصل مذہب ہی سے بیزار ہو گئے، اسی طرح مسلمانوں کے طرزِ حکمرانی کا آج یہ ردعمل ہے کہ دنیا اسلامی حکومت کے نام سے گھبراتی ہے۔ غیر مسلمین کا ذکر کیا جبکہ خود اکثر اسلامی ملکوں کے ارباب سیاست و حکومت بھی اسلامی حکومت کے نام سے گھبراتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا طریقہ حکومت اسلامی اصول و مقاصد سے بیگانہ نہ ہوتا تو انھیں اسلامی حکومت کے نام سے جذبہ فخر کا بے پایاں احساس ہوتا اور غیر مسلم دنیا بھی اسے اپنے لیے خدا کی بڑی رحمت سمجھتی۔

(منقول از رسالہ ''البرہان'' لاہور'' نوروز نمبر'' یکم مارچ ۱۹۵۰ء)

اللھم صل علی محمد وال محمد

تحریر: حجۃ الاسلام علامہ ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

سیرت خود ایک ساکت وصامت حقیقت ہوتی ہے، اس لیے اس سے استدلال قائم کرنے سے پہلے اس کی نوعیّت پر نظر کرنا ضروری ہوتا ہے کہ نوعیّت کو دریافت کیے بغیر سیرت سے استدلال ایک بے معنی امر ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے کسی معصومؑ کو دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ظاہر ہے کہ اس نماز سے اتنا تو ضرور اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس وقت میں دو رکعت نماز قائم کرنا جائز ہے۔ لیکن یہ فیصلہ ناممکن ہوتا ہے کہ یہ نماز سنت ہے یا واجب ہے۔ اس نماز کی نوعیت دریافت کرنے کے لیے مذہب کے دوسرے قوانین پر نظر کرنا ہوگی۔ مثلاً یہ دیکھا جائے گا کہ اسلام میں واجب نمازوں کی تعداد معین ہوچکی ہے اور معصوم کے خُصوصیات کی بھی تحدید کی جاچکی ہے، اس لیے یہ نماز واجب نہیں ہوسکتی اور نہ اس کا شمار خُصوصیات معصومین میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس نماز کا مُستحب ہونا امر یقینی ہے۔ یہی حال جملہ سیرتوں کا ہے کہ جب تک ان کی نوعیّت نہ معلُوم ہوجائے اس وقت تک ان کے بارے میں فیصلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پردے کے بارے میں بھی اسلام کا موقف دریافت کیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں سیرت کا تجزیہ کیا جاسکے۔

قرآن وسنت کے اکثر بیانات سے اس موقف کی وضاحت کرنے کے لیے اس وقت معصومہ عالم جناب فاطمہ زہراء کا یہ فقرہ پیش نظر ہے جو آپ نے سرور کائنات کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ آپ کا سوال یہ تھا کہ عورت کے لیے سب سے اچھی چیز کیا ہے اور معصومہ عالم کا جواب یہ تھا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ نہ اس پر کسی مرد کی نگاہ پڑے اور نہ وہ کسی مرد کو دیکھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پردہ یک طرفہ ستر کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں طرفین کی حیا وغیرت کو دخل ہے۔ پردہ صرف گھر میں بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ گھر سے نکلنے کے بعد بھی مردوں کی نظر سے بچنے کا نام ہے اور گھر میں رہ کر بھی نامحرم کی نگاہ سے اپنے کو بچائے رکھنے کا نام ہے۔ عورت کو قانونی اعتبار سے گھر کے اندر رہ کر امور خانہ کی نگرانی کرنا چاہیے اور کبھی بر بنائے ضرورت نکل بھی آئے تو اپنے کو مردوں کی نظر سے بچائے رکھنے چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد کو عورت پر حکومت کا درجہ اسی معنی میں دیا ہے کہ وہ عورت کو گھر سے باہر نہ جانے دے۔ بیرون خانہ کی مصلحتوں کو

عورت کی نسبت سے مرد زیادہ بہتر جانتا ہے اور اگر ان حالات کے جانتے ہوئے بھی باہر جانے کی اجازت دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی شرم و حیا رخصت ہو جائے اس کا دین و مذہب کہاں رہ جاتا ہے؟

معصومہ عالم کے اسی ارشاد گرامی کی روشنی میں آپ کی اس سیرت کو دیکھا جاسکتا ہے کہ آپ کے دروازے پر سرور کائنات اپنے محترم صحابی کو لے کر آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی تو معصومہ عالم نے اجازت دے دی۔ لیکن آپؐ نے دوبارہ سوال کیا تو آپ نے عرض کیا کہ گھر آپ کا گھر ہے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ میرا ایک صحابی بھی ہے۔ جناب سیدہ نے عرض کیا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے پاس ایک چادر ہے جس سے یا سر کو چھپا سکتی ہوں یا پیروں کو۔ ایسی حالت میں کسی صحابی کو گھر کے اندر آنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہوں۔ واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معصومہ عالم صحابی کو گھر کے اندر آنے سے نہیں روکنا چاہتیں بلکہ پردے کے حدود پر روشنی ڈالنا چاہتی ہیں۔ یعنی اگر میرے پاس چادر ہوتی تو ضرور اجازت دے دیتی اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت نے اپنا عبا عنایت فرما دی تو جناب سیدہ نے بخوشی صحابی کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

معصومہ کے گزشتہ ارشاد سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ عورت یا مرد کے دیکھنے کا مطلب اس کے چہرے اور صورت کا دیکھنا ہے۔ لیکن آپ کی سیرت نے اس کی مزید وضاحت اس طرح کر دی کہ اس کے حدود میں قد و قامت بھی آجاتے ہیں، جیسا کہ مشہور ہے کہ آپ نے اسماء سے یہ شکوہ کیا کہ مدینہ میں جنازہ اٹھانے کا طریقہ ناقص ہے، اس سے مردے کا قد و قامت نمایاں ہو جاتا ہے اور جب اسماءؓ نے حبش کے طریقہ سے تابوت بنا کر دکھایا تو آپ کے لب ہائے مبارک پر مُسکراہٹ آگئی۔ (بعض روایات میں یہ طریقہ معصومہ کے خواب کا نتیجہ بتایا گیا ہے) ظاہر ہے کہ آپ کا اضطراب مرنے کے بعد کے لیے تھا، جب انسان سے ہر حکم اور فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اضطراب بتاتا ہے کہ آپ مرنے کے بعد بھی اپنے قد و قامت کو نمایاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں اور جو مرنے کے بعد اس بات کو پسند نہ کرتا ہو وہ زندگی میں کیسے پسند کر سکتا ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب رسولِ اکرم آپ کو مباہلہ میں لے کر چلے تو آگے خود رہے اور پیچھے علی کو کر دیا تا کہ فاطمہ کا قد نمایاں نہ ہونے پائے اور فاطمہ کے نقشِ قدم پر کسی کی نظر نہ پڑنے پائے۔

حضرت فاطمہ زہراء کی یہی بلندی نفس تھی جس کی عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ ابن مکتوم نابینا صحابی کو لے کر اپنے گھر میں تشریف لائے اور عائشہ و حفصہ سے کہا کہ حجرے میں چلی جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ وہ نابینا ہے لیکن تم تو نابینا نہیں ہو۔ اسلام جہاں اس کا نظر کرنا پسند نہیں کرتا ہے وہیں تمھارا بھی نظر کرنا پسند نہیں کرتا ہے۔

مذکورہ بالا واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ

باقی صفحہ ۳۹ پر

اہل قبلہ کی حرمتِ تکفیر

کے خوف سے کلمہ پڑھ لے وہ مسلمان نہیں ہو جاتا، اور نہ ہی اس کا خون قابل احترام قرار پاتا ہے۔ مسلمان اسی وقت ہوگا جب وہ کسی خوف و ڈر کے بغیر کلمہ پڑھے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر کلمہ پڑھنے والے کو مسلمان قرار دیا ہے۔ اقرار اور تسلیم بھی کلمہ کے حکم میں ہے۔ مثلاً اگر وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں یا یہ کہتا ہے کہ تمہارے دین پر ہوں تو اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔

(فتح القدیر شوکانی، جلد ا صفحہ ۵۷۹ طبع بیروت)

مومن کون ہے؟ قرآن اور روایات کی رو سے ایمان اور اسلام کا معیار کیا ہے؟ جو معیار و میزان قرآن و سنت نے بیان کیا ہے اگر کوئی اس پر پورا اترتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ کسی اور عمل کی وجہ سے اسے کافر کہنا غلط ہے۔ یہاں ہم وہ معیار بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

باب المسائل

نخواستہ امام مہدیؑ کا سرے سے انکار کر دے تو وہ مذہب شیعہ سے خارج متصوّر ہوگا۔

سوال نمبر ۱۴: پندرہ شعبان کو امام زمانہ کے حضور عریضہ دریا میں ڈالنا (براہِ راست حاجت روائی کی دعا کرنا)

☆ نماز (بندگی خدا) میں غیر خدا (ائمہؑ) کا نام لینا دعائیں مانگنا۔

☆ غیر خدا (بالخصوص امام حسینؑ اور غازی عباسؑ) کے نام کے بچھڑے پال کر سو فیصد ان کے نام سے منسوب کر کے جلسوں یا محرم پر ذبح کرنا، کیا یہ افعال جائز ہیں؟

جواب: باسمہ سبحانہ! یہ محض ایک رسم ہے جس کا شرعاً کوئی حکم نہیں ہے۔ نماز افضل ترین عبادت ہے اور ظاہر ہے کہ پوری کائنات میں معبود صرف ایک ہے جس کا ذاتی نام ''اللہ تعالیٰ'' ہے۔ اور نذر اور منت صرف خدا کے ذاتی یا صفاتی نام کی مانی جاتی ہے۔ کسی اور نام کی نہیں۔ (و ذلك اوضح من ان يخفى) لہٰذا ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

بقیہ: پردہ اور سیرتِ معصومینؑ

عورت کی اصلی منزل حدود خانہ ہے اور اس کا اصل منصب امور خانہ کی نگرانی ہے۔ اس کے رُخ و رخسار کو نگاہِ مردم سے بچانے میں خیر ہے اور اس کے قدو قامت کو اجنبی نظروں سے بچائے رکھنے میں عافیت ہے۔ یہی کردار معاشرہ کی اصلاح کا ضامن ہے اور یہی اصول حیات سماج کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اگر چہ اس کے حدود و واجبات سے زیادہ ہیں اور واجبات میں اس میں سے بہت سی چیزیں شامل نہیں ہیں۔ لیکن خیر بہر حال خیر ہے۔ اور حتی الامکان اس کا لحاظ ضروری ہے، بلا ضرورت خیر کو ترک کر دینا بعض اوقات شر کا باعث ہو جاتا ہے۔

خداوند عالم امت توحید و رسالت اور پیروان مسلک ولایت کو اس خیر کے حاصل کرنے کی توفیق کرامت فرمائے اور ہمارے معاشرے کو ہر شر و آفت سے محفوظ رکھے۔

☆ آہ مولانا کاظم حسین صاحب آف کالا ضلع ڈی جی خان
مولانا کاظم حسین آف کالا ضلع ڈی جی خان مُختصر علالت کے بعد راہیِ ملک بقا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عنایت فرمائے۔

☆ مولانا سید محمد شاہ ناصر مرحوم کی والدہ ماجدہ مُختصر بیماری کے بعد مگر شوہر اور شورہ اور اولاد کی موت کے صدمہ سہنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو سیدۃ کائنات کے جوار پر انوار میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر واجر سے نوازے۔ بحق النبیؐ و آلہؑ

☆ جناب لیاقت حسین حیدری آف بھلوال کے چچازاد غلام حسین رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

☆ محمد یار واہلہ اور محمد حیات واہلہ کی والدہ شیر محمد والا تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں وفات پا گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عنایت فرمائے۔

☆ جناب ملک خالد اعوان آف چک ۳۶ شمالی ضلع سرگودھا کی والدہ ماجدہ رضائے الٰہی سے وفات پا گئی ہیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی بخشش فرمائے اور پسماندگان کو صبر واجر سے نوازے۔

☆ ملک علی خان صاحب سیکورٹی گارڈ جامعہ علمیہ سلطان المدارس سرگودھا کی پھوپھی جان رضائے الٰہی سے وفات پا گئی ہیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

Registered No. (G) H.C/722

جامعہ مصباح العلوم الجعفریہ سرائے مہاجر ضلع بھکرؒ کا

منجانب پرنسپل و اراکین جامعہ مصباح العلوم الجعفریہ سرائے مہاجر ضلع بھکرؒ